مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں

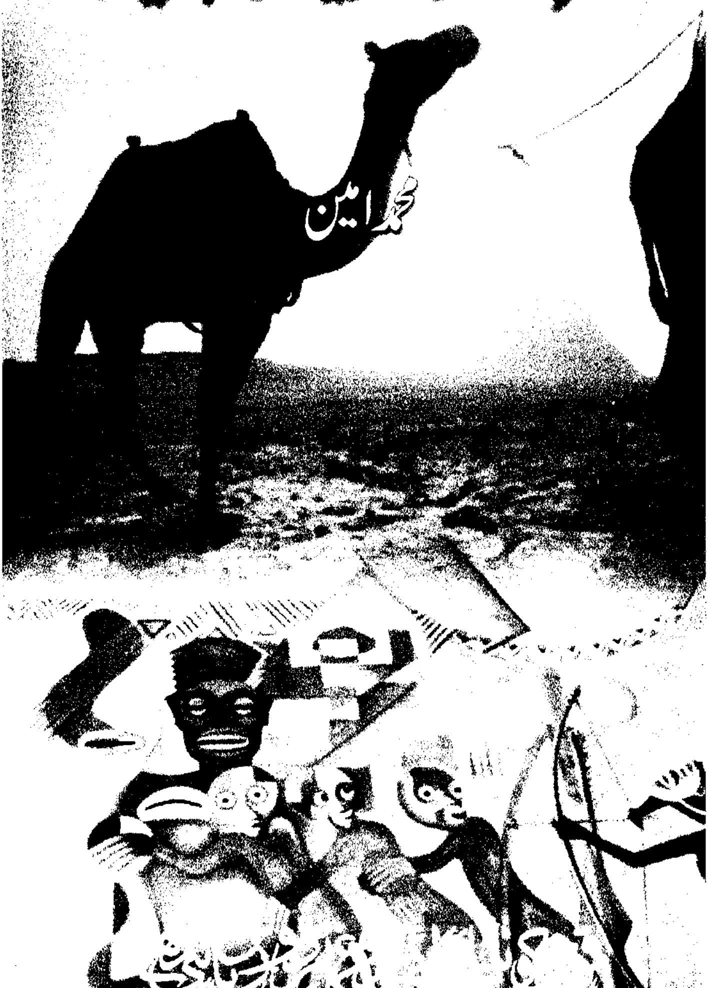

مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں

محمد امین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1984
دوسری طباعت	:	2010
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/10 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	330

Misr aur Shumali Africa ki Kahaniyan

by

Mohammad Ameen

ISBN :978-81-7587-440-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159

ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، 1397، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے جس کا بنیادی مقصد اردو کی ترویج واشاعت کے لیے منصوبے بنانا اور ان کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ یہ مرکزی حکومت کا سب سے بڑا ادارہ ہے جو اردو کے فروغ کے لیے قائم کیا گیا۔ اس نے اردو زبان اور ادب کے تحفظ اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف سمتوں میں کام کیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ قومی اردو کونسل مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں شائع کرتی ہے جن کا مقصد سماجی ترقی، معاشی حصول، بیداری اور عصری تعلیمی اور ثقافتی ضرورتوں کی تکمیل ہے۔ اس ضمن میں قومی اردو کونسل ایک طرف تو کلاسیکی ادب کی بازیافت کے لیے اردو کے ادبی شہ پاروں کو شائع کرتی ہے تو دوسری طرف مختلف سماجی علوم وفنون کی اہم کتابوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے کوشاں رہی ہے تاکہ ہماری

ثقافتی نیز نصابی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ اس سلسلے میں ہماری خاص توجہ بچوں کے ادب پر بھی رہی ہے تا کہ ہمارے بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرسکیں اور ہماری ادبی، ثقافتی نیز سائنسی فتوحات سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے کونسل اس سلسلے کے تحت بچوں کی کہانیاں بھی شائع کرتی ہے۔ 'مصر اور شمالی افریقہ کی کہانیاں' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کو محمد امین نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں مصر اور شمالی افریقہ کی لوک کہانیاں ہیں جنھیں محمد امین صاحب نے ان ملکوں کے اپنے سات سالہ قیام۔ کے دوران مرتب کیا اور بچوں کے لیے آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ قومی اردو کونسل نے 1984 میں اس کتاب کو شائع کیا تھا اب اس کی دوسری طباعت کو بھی اس یقین کے ساتھ پیش کر رہی ہے کہ یہ کتاب بچوں کی ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کرے گی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اگر اس کتاب میں انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو آگاہ کریں تا کہ اگلی اشاعت میں اس کا ازالہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

فہرست

تعارف 7

قادرہ کی حاضر جوابی 11

ابوالہول کا خواب 23

جادو کا کچھوا 30

لڑکی جو غزالوں کے ساتھ رہتی تھی 40

گیبن ہانکنے والا عمر 53

جادو کی بانسری 62

انتساب

رعنا اور افسر

کے نام

جنھیں نئی نئی کہانیاں پڑھنے کا

بے پناہ شوق ہے

تعارف

افریقہ میں خصوصاً ایتھوپیا، زمبیا، کینیا اور تنزانیا میں میرا قیام ۲۴ نومبر ۱۹۶۶ء سے مئی ۱۹۷۲ء تک رہا۔ اس سات سال کے قیام کے دوران میں نے ان ملکوں کی تاریخ، جغرافیہ، سماجی اور قدرتی ماحول کے متعلق بیسیوں کتابیں پڑھیں۔ سفاریوں سے باتیں کیں۔ ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ ایشیا، یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے مختلف ممالک اور قومیت کے لوگوں سے ملاقات کی۔ ان میں کم سے کم اُنیس قومیت کے اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئر اور فنی، کان کنی اور صنعت کے ماہرین نمایاں ہیں۔ ایتھوپیا، مشرقی افریقہ، مصر، شمالی افریقہ، سوڈان، وسطی اور جنوبی افریقہ کے متعلق سلائڈس، فوٹو اور فلم دیکھیں۔ اور وہ جو کہاوت ہے کہ "انسان جو چیز دیکھ لیتا ہے اسے بھول نہیں سکتا" یعنی ہر بات اسے یاد رہتی ہے اور اصلی رنگ و رُوپ کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ افریقہ کے متعلق کچھ اسی قسم کے تاثرات میرے بھی ہیں۔ چشم دید اور بذاتِ خود جن چیزوں کا میں نے مشاہدہ کیا وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور خاص بات یہ کہ جو باتیں کتابوں میں میں نے پڑھ رکھی تھیں دیکھنے پر ان کی حقیقت کچھ اور ہی نکلی۔ مختصراً یہ کہ میں نے اس برِاعظم کی ہر چیز کو لاجواب پایا۔ عام لوگوں کے قصے، کہانیوں میں قدرتی ماحول کے اثرات اور بہت زیادہ اچھوتا پن پایا۔

ایتھوپیا میں قیام کے دَوران ایک لمبی تعطیل میں چند مخصوص ساتھیوں نے دریائے نیل کے راستے مصر جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ سفر خطرناک اور غیر معمولی دلچسپیوں سے بھرپور رہا۔ کافی مشکلات اور پریشانیوں کے بعد جب ہم سوڈان کی راجدھانی خرطوم پہنچے تو کئی ساتھیوں کی ہمت پست ہو گئی۔ دریا کے راستے آگے بڑھنا ناممکن سا نظر آیا۔ لیکن خرطوم سفید نیل اور نیلے نیل کا سنگم بھی ہے۔ یہ تاریخی شہر بھی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہمت بڑھی۔ ازسرِ نَو جوش پیدا ہوا۔ پھر نئی اُمنگوں اور ولولوں کے ساتھ ہم سب نے قدم آگے بڑھایا۔ البتہ دریائے نیل کا راستہ ہم نے ترک کر دیا اور بسوں کے ذریعہ خرطوم سے قاہرہ کا سفر طے کیا۔ اس مہم کی الگ داستان ہے لیکن جہاں سے بھی ہم لوگ گزرے میری نظر عوام کی زندگی اور لوک کہانیوں پر رہی۔ ہم نے دُوبدُو سوڈان اور مصر کے عوام سے بات چیت کی۔ ان کی تاریخ، تہذیب و تمدّن اور رہن سہن اور روزمرہ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ کہانیاں جو اس کتاب میں درج ہیں وہ بھی مجھے عوام اور ان کے چند نمائندوں کے ذریعہ ملیں۔

پہلی کہانی "قادرہ کی حاضر جوابی" ہے۔ اس میں مصر کا ہلکا سا پس منظر ہے اور ایک بار یہ کہانی شروع کر دینے کے بعد آپ کی دلچسپی بڑھتی جائے گی اور اس کے تسلسل میں آپ محو ہو جائیں گے۔ خود بخود یہ جی چاہے گا کہ اسے ختم ہی کرلیں۔

دوسری کہانی "ابوالہول کا خواب" ہے۔ اس میں ایک شہزادے کی کہانی ہے جس کا نام تھاتمس تھا۔ یہ نام مصر کے ایک قدیم دیوتا کے نام سے ملتا تھا جس کا نام "تھاتھ" تھا۔ یہ چاند کا دیوتا تھا۔ اس طرح تھاتمس کا حُسن چاند کے حُسن سے ملتا جلتا تھا۔ "تھاتھ" جادو کی کتابوں کا بھی دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح

تھا تھمس بھی عقل و دانش میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتا تھا۔ اسے شکار کھیلنے کا شوق تھا اور ایک دن وہ اسی مہم پر نکلا تھا کہ اس نے ابوالہول کا خواب دیکھا۔ ابوالہول کی کیا اصلیت ہے؟ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟ پھر یہ کہ شہزادہ تھا تھمس نے خواب میں اور کیا کیا دیکھا اور پھر وہ بادشاہ بن پایا یا نہیں؟ اس کہانی سے کچھ نئی بات بھی معلوم ہو سکتی ہے۔

تیسری کہانی "جادو کا کچھوا" ہے۔ اس میں تین بھائیوں کی داستان ہے جو شہزادے ہیں۔ ان میں سے ہر شہزادے نے اُس زمانے کی رسم کے مطابق تیر چلایا اور قلعہ میں جس گھر پر بھی ان کا تیر گرا اُسی گھر میں ان کی شادی ہو گئی۔ لیکن عجیب اتفاق کہ تیسرے بھائی میرزا کا تیر ایک ایسے مکان پر گرا جس کے اندر ایک کچھوا رہتا تھا۔ بار بار تیر چلانے کے باوجود یہ کسی دوسرے گھر کی چھت پر نہیں گرا۔ ظاہر ہے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کچھوے سے شادی کرے۔ اس لیے اس نے اپنے والدِ محترم سے کہا کہ "خدا کی یہی مرضی ہے تو میرا سر تسلیم خم ہے۔ دیکھیے میں نے تین بار تیر چلایا اور ہر بار اسی چھت پر جا کر گرا۔ اب مجھے انکار نہیں اور میں بخوشی کچھوے کو اپنی دُلہن بناؤں گا۔" اس کے بعد کیا ہوا؟ کہانی میں اس کے علاوہ بھی کچھ اور دلچسپ باتیں ہیں۔

چوتھی کہانی "لڑکی (حلیمہ) جو غزالوں کے ساتھ رہتی تھی" یہ شمالی افریقہ کے خشک علاقوں کی کہانی ہے۔ اس میں خاص طور سے الگ الگ طبقے کے انسانوں کے کردار کی جھلک ملتی ہے۔ حلیمہ کی بھی اپنی الگ ایک آپ بیتی ہے اور پے در پے مصائب کا اس نے کس طرح مقابلہ کیا اور اس نے ہمت اور عقلمندی سے کام لے کر ہر مکار اور بُرے آدمی کا اصل روپ ہمارے سامنے پیش کیا۔ داستان بڑی عجیب و غریب ہے اور اس کے اختتام پر ہمدردی کا جذبہ آپ کے اندر کچھ اس طرح اُمڈے گا کہ آپ یہ سوچیں گے کہ کہیں یہ آج ہی کا تو واقعہ نہیں ہے۔

پانچویں کہانی "گپیں ہانکنے والا عُمر" کی ہے۔ اس میں جھوٹ بولنے اور گپ ہانکنے کا مقابلہ ہے۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا بھائی عُمر چالاک تھا۔ اس نے ایسی گپ لگائی کہ اس کا مدِمقابل ہار گیا اور اس نے کہا "اگر یہ ساری گپ سچ ہے تو پھر تمہارا جھوٹ کیسا ہوگا۔ میں نے ہار مان لی۔ تم جیت گئے۔ میں اس سے بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا" اور پھر اس نے اپنی دولت، مویشی، کھیت اور ساری جائیداد عُمر کو دے دی۔

چھٹی کہانی "جادُو کی بانسری" کی ہے۔ یہ الجیریا کے قبائلی عرب کی کہانی ہے۔ یہ عرب چرواہے تھے اور زیادہ تر بھیڑیں پالتے تھے۔ بدّو اور احمد انہیں کے نمائندے ہیں۔ بدّو کو جادُو کی بانسری کیسے ملی۔ اس نے اسے کیسے کیسے آزمایا۔ بھیڑیں دُبلی ہو رہی تھیں ان کا کیا راز تھا۔ احمد کون تھا۔ اس کا اور اس کے گھر والوں کا کیا انجام ہوا؟؟ غرض یہ کہ یہ کہانی بھی کسی اور کہانی سے کم دلچسپ نہیں ہے۔

یہ ساری کہانیاں عوام کی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ ان کے اِرد گِرد کے قدرتی ماحول، سماجی ڈھانچے، تہذیب و تمدّن کے جلوے، اس کی بے پناہ دولت اور اعتقادات کی عکاسی کرتی ہیں۔

خدا کرے کہ افریقہ کے متعلق مزید کہانیاں پڑھنے کا ہم سب میں شوق اور جذبہ ہو۔

محمد امین

قادرہ کی حاضر جوابی

قدیم زمانے میں شہر قاہرہ کا حکمراں ایک نوجوان شہزادہ تھا۔ وہ ایک عالی شان محل میں رہتا تھا۔ اس محل کے قریب ایک سبزی بیچنے والا بھی رہتا تھا۔ اس کے تین لڑکیاں تھیں۔ ان کا نام فاطمہ، فوزیہ اور قادرہ تھا۔ یہ سبھی صورت شکل کی اچھی تھیں لیکن سب سے چھوٹی لڑکی قادرہ کی کچھ اور ہی بات تھی۔ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار بھی تھی۔

لڑکیوں کا باپ خوش حال تھا۔ اس کا نام علی تھا۔ اس کے کھیت دریائے نیل کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔ مٹی زرخیز تھی۔ اس لیے سویابین کی فصل نہایت اچھی ہوتی تھی۔ ہر سال موسم بہار میں نیل میں سیلاب آتا تھا اور جب اس کا پانی اتر جاتا تھا تو زرخیز مٹی کی ایک تہہ بیٹھ جاتی تھی۔ اس طرح علی خوش قسمت تھا اور سویابین کی فصل کو اُگاکر قاہرہ کے بازار میں بیچتا اور مُنھ مانگے دام پاتا۔ علی کا مکان بھی اس کی حیثیت کے لحاظ سے اچھا خاصا تھا اور شہزادے کے محل سے متصل تھا۔

شہزادہ نوجوان تھا۔ حکومت کے داؤ پیچ سے ابھی وہ پوری طرح واقف نہیں تھا یا یوں سمجھیے کہ حکومت چلانا اُسے ٹھیک سے نہیں آتا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ گھمنڈی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے آپ کو وہ بڑا اونچا انسان سمجھتا تھا اور گھمنڈی تھا۔ اگرچہ وہ خوب صورت بھی تھا اور جب وہ ریشم کے قیمتی کپڑے پہنتا اور ان میں ہیرے جواہرات جڑے ہوتے تو وہ زیب دیتے۔ اس کی پگڑی بھی بھلی معلوم ہوتی تھی اور تلوار چاچم کرتی تھی۔ قاہرہ کی سب ہی لڑکے لڑکیاں اس سے آنکھیں ملانے کو ترستیں۔ شہزادے کا حلیہ ہی بڑی کشش رکھتا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں، نرم ریشمی کالے بال اور اس کی گھنگھریالی داڑھی۔ ان سب کا کیا کہنا۔

کبھی کبھی شہزادہ اپنی محل کی زندگی سے تنگ آجاتا۔ عیش و عشرت و شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے اسے کچھ کوفت سی محسوس ہوتی۔ وہ چاہتا تھا کہ باہر جاکر دیکھے کہ شہر میں لوگ کیسے رہتے ہیں لیکن آداب و روایت سے وہ مجبور تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ ہر روز وہ اپنے محل کے پھاٹک کی کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ جاتا اور آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا۔ اُونٹ لدے پھندے گزرتے، قُلی سروں پر سامان لے جاتے نظر آتے۔ لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ لڑکیاں جو بغیر برقعے کے ہوتیں اس کی طرف دیکھتیں اور مسکراتیں۔

ہر روز صبح سویرے نوجوان شہزادہ علی کی لڑکیوں کو ڈھونڈھتا۔ بھیڑ جو وہاں سے گزرتی تو اس کی آنکھیں ان لڑکیوں کو تلاش کرتیں۔ اتفاق کی بات کہ یہ لڑکیاں صبح ہی صبح گُل بُوٹے اور نقش و نگار کے سبق سیکھنے کے لیے اُدھر سے گزرتیں۔ ان کے چہروں پر نیلے رنگ کے ہلکے سے نقاب ہوتے۔ نقاب میں سے صاف دکھائی دیتا کہ وہ کتنی دیدہ زیب ہیں۔ ان کی آنکھیں بڑی اور کٹورے کے مانند تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی شہزادہ کھِل اُٹھتا اور کہتا "علی کی لڑکیو! تم سب کو سلام۔"

بڑی لڑکی فاطمہ بڑھ کر سلام کا جواب دیتے ہوئے کہتی "شہزادے وعلیکم السلام خدا تمھاری عمر دراز کرے۔"

منجھلی لڑکی فوزیہ بھی کہتی "وعلیکم السلام" لیکن قادرہ ایک طرف مڑ جاتی اور خاموش رہتی۔ شاید اُسے شہزادے کا گھمنڈ پسند نہیں تھا۔ اگر شہزادہ گھمنڈی تھا تو وہ بھی کم گھمنڈی نہیں تھی۔ بہرحال ممکن ہے کوئی بات اور ہو لیکن یہ طے ہے کہ قادرہ کبھی اس کے سلام کا جواب نہیں دیتی تھی۔

قادرہ کا یہ رُوکھاپن انداز شہزادے کو پسند نہیں تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی جوان لڑکی اس سے اس طرح پیش آئے۔ پُرامید ہو کر وہ قادرہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا "قادرہ! اس سال تمھارے باپ کی فصل کیسی ہوئی ہے؟"

"تم جیسے بڑے آدمی اور شہزادے کو بھلا اس سے کیا سروکار" قادرہ پلٹ کر کہتی۔

یہ بے باکی دیکھ کر شہزادہ قادرہ کو گھور کر رہ جاتا۔ ظاہر ہے کہ قادرہ کوئی ایسی ویسی لڑکی تو تھی نہیں۔ وہ چنچل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوبصورت تھی۔ بلکہ ان دنوں قاہرہ میں اس کے حُسن کا بڑا چرچا تھا۔ وہ ملکہ حُسن کے نام سے مشہور تھی۔

مصر میں بڑی بُوڑھیوں کی کہاوت ہے کہ مرد ہمیشہ ایسی چیز کو تلاش کرتا ہے جو اُس سے دُور بھاگتی ہے۔ اس طرح شہزادہ قادرہ کے جتنا قریب آنے کی کوشش کرتا وہ اپنا دامن جھاڑ کر صاف بچ نکلتی۔ شہزادہ عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ اُدھر قادرہ کے چرچے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ لوگ اس کے اخلاق کی بھی بہت تعریف کرتے۔

شہزادہ برابر کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتا۔ اس کو یہ فکر تھی کہ آخر قادرہ اس کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیتی؟

بہت دنوں تک اُدھیڑ بُن میں مبتلا رہنے اور انتہائی کوشش کے باوجود جب وہ اس کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا تو اُسے بہت غصّہ آیا۔ اُس نے سوچا کہ اسے کوئی سزا دینی چاہیے اور اس کے باپ کو بُلانا چاہیے۔

علی کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ طیش کھاتے ہوئے شہزادے نے اس سے کہا۔

" تمھاری لڑکی وحشی ہے اور چوں کہ تم اس کے باپ ہو اس لیے تمھیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ کان کھول کر سُن لو۔ تین دن کے بعد تم کو محل میں پھر آنا ہے لیکن یاد رکھو کہ جیسے ہی تم داخل ہوگے تمھیں ایک ساتھ ہنسنا بھی پڑے گا

اور رونا بھی۔ اگر تم ایسا نہیں کر پاؤ گے تو تمھارا مال ضبط ہو جائے گا اور سارے
کا سارا خزانے میں داخل کر لیا جائے گا۔"

علی جب گھر لوٹا تو بہت فکر مند تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اپنے باپ کا چہرہ دیکھتے ہی قادرہ بھانپ گئی۔ اس نے پوچھا "والدِ محترم! آپ غمگین کیوں ہیں؟"

علی نے جواب دیا "غمگین ہونے کی بات ہی ہے بیٹا! تین دن بعد مجھ کو محل میں حاضر ہونا ہے اور اسی وقت ہنسنا بھی پڑے گا اور رونا بھی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ نہیں تو ظاہر ہے ہماری ساری جائداد ضبط ہو جائے گی۔"

"آپ گھبرائیے نہیں والدِ محترم!" قادرہ نے کہا "اس کا حل بہت آسان ہے۔ پیاز کی ایک گانٹھ لیجیے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیجیے۔ جب محل میں جائیے تو پیاز کے ٹکڑوں کو ناک کے نیچے چھپا کر رکھ لیجیے۔ شہزادے کے دیکھنے سے پہلے پیاز کا رس آنکھ پر رگڑ لیجیے۔ پھر خود ہی آنسو کی دھار بہہ نکلے گی۔ اس کے بعد شہزادے کو دیکھ کر قہقہہ لگائیے۔ اُدھر آنسو کی دھار نکلے گی اِدھر قہقہہ لگائیے گا۔"

تین دن بعد جب سویابین بیچنے والا محل میں حاضر ہوا تو شہزادے کو دیکھتے ہی اس نے قہقہہ لگانا اور رونا شروع کر دیا اس لیے کہ پیاز کا رس لگانے سے اس کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار اس طرح بہہ رہی تھی گویا کہ موسمِ بہار میں دو نالے پھوٹ پڑے ہوں۔

شہزادہ حیران اور سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر یہ ترکیب علی کو سوجھی کیسے؟ اس نے سوچا ہو نہ ہو یہ قادرہ کی حرکت ہے۔ اسی نے اپنے باپ کو یہ ترکیب بتائی ہوگی۔ لیکن شہزادہ بہر حال شہزادہ تھا۔ وہ شکست ماننے والا کہاں! اس نے علی سے کہا۔

"دوسرا حکم یہ ہے کہ تین دن کے بعد تمھیں پھر یہاں آنا ہے لیکن یاد رکھو کہ جب تم میرے سامنے آؤ گے تو ایک ہی وقت میں تم کو ننگا بھی ہونا پڑے گا اور کپڑوں میں ملبوس بھی۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو ہم تمھیں قید خانے میں بند کرا دیں گے۔"

علی جب گھر لوٹا تو اس نے اپنی لڑکیوں سے کہا: "اب تو خدا ہی نگہبان ہے۔ شہزادے نے حکم دیا ہے کہ بیک وقت مجھ کو ننگا بھی ہونا ہے اور کپڑوں میں ملبوس بھی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

چھوٹی لڑکی نے باپ کے بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت آسان ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ فوراً ہی دریائے نیل کے کنارے چلے جائیے اور کسی مچھیرے سے ایک بڑا سا جال خرید لائیے۔ اس جال سے میں آپ کے لیے ایک بڑا سا لبادہ (گاؤن) بنا دوں گی جسے پہن کر سر سے پیر تک آپ اپنے کو ڈھک لیں گے۔ اس طرح لباس میں آپ ملبوس ہو جائیں گے اور ننگے بھی نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ جال کے سوراخوں سے جسم صاف دکھائی دے گا۔"

اس طرح گھمنڈی شہزادے کو ایک بار پھر شکست ہوئی۔ اس نے سوچا۔ 'یقیناً یہ قادرہ کی حرکت ہے اور وہی اپنے باپ کو سکھا پڑھا کر بھیجتی ہے۔ یقیناً وہ کتنی چالاک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جتنی خوب صورت ہے اتنی ہی عقل مند بھی ہے۔ کاش کہ میری اس سے شادی ہو جائے،' اس کے بعد اس نے کہا۔

"اے سبزی بیچنے والے! آخر تمھاری لڑکی کب تک میرا مذاق اڑاتی رہے گی۔ اچھا اب تیسرا حکم سنو۔ اب کی بار وہ بھی تمھاری مدد نہیں کر پائے گی۔"

حکم یہ ہے کہ تین دن کے بعد تم پھر دربار میں حاضر ہو لیکن بیک وقت خچّر کی سواری بھی کرتے رہو اور پیدل بھی چلو۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو تمھیں کوڑوں کی مار پڑے گی۔"

شہزادے کا خیال غلط تھا کہ اب کی بار قادرہ بھی مدد نہ کرپائے گی۔ جب علی گھر لوٹا تو قادرہ کے پاس جواب موجود تھا۔

اُس نے باپ سے کہا "گھبرائیے نہیں! ہمارے پڑوس میں جو حکیم صاحب رہتے ہیں ان کے یہاں خچّر کا ایک بچّہ ہے۔ ابھی مشکل سے ایک ہفتہ کا ہوا ہے لیکن بہرحال وہ آسانی سے چل لیتا ہے۔ آپ اس بچّے کو لے جائیے اور اس پر سوار ہو جائیے۔ ظاہر ہے کہ پیر آپ کے زمین کو چھوتے ہوئے چلیں گے۔ اس طرح آپ کا کام بن جائے گا۔ سواری کی سواری اور پیدل کے پیدل۔"

تین دن کے بعد محل میں سویابین بیچنے والا حاضر ہوا۔ وہ ایک چھوٹے سے خچّر کی سواری کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر شہزادے کا چہرہ لمبا ہو گیا لیکن اب کی بار اُسے غصّہ نہیں آیا۔ فوراً ہی اُسے قادرہ کا خیال آگیا۔ اس کے متعلق بھلا وہ کسی سے کیا کہے۔ وہ حیران و پریشان تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے۔ سچ بات تو یہ تھی کہ شہزادے کو اس خوب صورت اور چالاک لڑکی سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاہم اس نوجوان کا عشق اتنا شدید نہیں تھا جتنا کہ اس کا گھمنڈ۔ وہ برابر یہی سوچتا رہا کہ اس لڑکی کو کیسے ہراؤں۔

قادرہ کتنی ہوشیار تھی، اس کا ایک اور ثبوت یہ تھا کہ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ اس کے متعلق شہزادہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ قبل اس کے کہ اس کو سزا دینے کی کوئی نئی ترکیب شہزادہ عمل میں لائے قادرہ نے خود اسے بُدھو بنانے کا پلان بنالیا۔ وہ سیدھی ایک دُوکان پر پہنچی جہاں ہتھیار اور دیگر

سازو سامان بکتے تھے ۔ اس نے دُکاندار سے کہا۔

" مجھے ایک ایسا لباس چاہیے جو پتلا ہو لیکن اس میں بہت سے گھنگھرو جُڑے ہوں اور جب میں اسے پہن کر چلوں یا قدم اٹھاؤں تو ان میں ایسی جھنکار پیدا ہو گویا بادل گرج رہے ہوں "

اس لباس کو پہن کر بہادر لڑکی نے اس کے اوپر ایک اور لبادہ پہن لیا۔ سر پر بڑا سا رومال باندھ لیا اور اس نے اپنے بالوں کو چھپا لیا تاکہ وہ ریگستان کا شیخ نظر آئے ۔ ہاتھ میں اس نے ایک بڑا سا ڈنڈا لے لیا۔ اس کا حلیہ صحیح معنوں میں ایسا ہو گیا گویا کہ وہ جنگلی گھوڑ سوار ہے اور کہیں دُور دراز ریگستان یا صحرا سے آیا ہے ۔

نیا لباس پہن کر جب وہ چلی تو کیا کھنک پیدا ہوئی ۔ اس کا نیا رُوپ دیکھ کر، آواز سُن کر محل کی نوکرانیاں اور دوسرے نوکر چاکر خوف زدہ ہو گئے۔ بھاگ کر میز اور کرسیوں کے نیچے دبک گئے ۔ چہروں پر پردے ڈال لیے۔ کیا مجال کہ کوئی اس کا راستہ روکتا۔ بے باکی سے محل میں داخل ہو کر قادرہ سیدھی اس کمرے کی طرف بڑھی جہاں شہزادہ نائی سے اپنے بال کٹوا رہا تھا۔

شہزادہ اس جنگلی جانور کے یک بیک نمودار ہونے سے حیران و پریشان ہو گیا ۔ اس نے سنتریوں کو آواز دی لیکن بھلا کسی کی کہاں ہمت کہ اس خوفناک درندے کو بھگا سکے ۔ یہاں تک کہ نائی بھی ڈر گیا اور شہزادے کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ قبل اس کے کہ شہزادہ اپنی کرسی سے اُٹھے قادرہ نے چیختے ہوئے اور ڈانٹ کر کہا:" شہزادے سُنو! میں شیطان کا قاصد بن کر آیا ہوں۔ چُپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ اگر اُٹھنے کی ہمت کی تو میں ابھی خنجر بھونک دوں گا "

لڑکی نے بڑھ کر قینچی اور اُسترا جو نائی گرا گیا تھا اُٹھا لیا۔ پھر اس نے

گھمنڈی شہزادے کی بھنویں اور آدھی داڑھی تراش لی ۔ اس کے بعد وہ فوراً وہاں سے غائب ہو گئی ۔

شہزادہ حیران و پریشان تھا ۔ اس کے ہوش آنے سے پہلے قادرہ وہاں سے غائب ہو گئی ۔ قبل اس کے کہ محل کے ملازم اپنی چھپنے والی جگہوں سے باہر نکلیں وہ صحیح و سالم اپنے گھر پہنچ چکی تھی ۔ جھٹ پٹ اس نے اپنا لباس اُتار کر باغ میں زمین کے نیچے گاڑ دیا ۔ اب قادرہ پھر علی کی لڑکی تھی اور اپنے گُل بُوٹے بنانے میں مصروف !

اگلے دن صبح تینوں بہنیں حسبِ معمول پھر محل کے پھاٹک سے گزریں ۔ شہزادہ کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا لیکن اس کے سر پر ریشم کی پگڑی بندھی ہوئی تھی اور چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ بہنوں نے دیکھا کہ محض اس کی کالی کالی آنکھیں نظر آ رہی ہیں جن سے خفگی ظاہر ہوتی تھی اور غصہ بھی ۔

شرافت اور نرمی سے مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا "سویا بین بیچنے والے علی کی لڑکیو ! تم سب کو سلام "

اب کی بار قادرہ نے جواب دیتے ہوئے کہا "وعلیکم السلام ۔ خدا تمھیں سلامت رکھے !" پھر وہ مسکرائی اور شرارتاً اس نے کہا "لیکن شہزادے ! تمھاری بھنویں کہاں ہیں ؟ اور تمھاری خوب صورت نصف داڑھی کہاں غائب ہے ؟"

اس کے بعد شہزادے کو حقیقت کا پتہ چلا ۔ وہ سمجھ گیا کہ کل والی حرکت قادرہ کی تھی اور یہی شیطان کا قاصد بن کر آئی تھی اور اسی نے اسے ڈرایا تھا اور اس کا مذاق اُڑایا تھا ۔

اس نے سوچا ۔ مانا کہ یہ خوب صورت ہے اور یہ بھی مانا کہ اس سے عشق ہے لیکن اب کی بار تو اس نے حد ہی کر دی ۔ آخر میں ایک شہزادہ ہوں ۔ اتنی بڑی حرکت

اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کے لیے قادرہ کو سزا بھگتنی پڑے گی اور شاید اسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

اس نے سوچا۔ دماغ پر زور دیا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی کہ اس لڑکی کو کیسے ڈراتے اور اسے کڑی سے کڑی سزا دلواتے۔ اسے محل میں لانا آسان نہیں۔ ہر پہلو پر نظر رکھنی پڑے گی۔

آخرش اس نے سویابین بیچنے والے کو بُلوا بھیجا۔ اس سے کہا: "تمھاری لڑکی قادرہ اچھی ہے، چالاک ہے۔ میں اسے محل کی شہزادی بنانا چاہتا ہوں۔ تم انکار نہ کرنا ورنہ خیریت نہیں۔ میں تم کو اور تمھارے خاندان کے ہر ایک فرد کو صحرا میں دفن کرا دوں گا۔"

علی نے قادرہ سے کہا: "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم محل کی رانی بن رہی ہو۔ خدا مبارک کرے۔ شہزادہ تم کو یقیناً پسند کرتا ہے ورنہ تم کو اپنی بیگم نہ بناتا۔ تم رضامند ہو جاؤ ورنہ ہم سب کی خیریت نہیں۔"

خلافِ توقع قادرہ خاموش رہی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شہزادے کی محبت میں خود گرفتار ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جان بُوجھ کر اسے چھیڑتی رہی ہو تاکہ وہ اس کی توجہ کا مرکز بنی رہے۔

لیکن اب بھی قادرہ کو شہزادے پر بھروسا نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ تنگ کرنے کی وجہ سے وہ خفا ہو اور غصّے میں بُھنا بیٹھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شادی کرنا اس کی نئی سازش ہو۔ بہرحال ہر حالت میں اسے چوکنّا رہنا چاہیے۔

شادی طے ہو گئی اور اس کی تاریخ قریب آ گئی۔ ایک دن پہلے قادرہ نے نان بنانے والے سے ایک نئی فرمائش کی۔ نان بائی سے اس نے کہا: "میرے لیے چینی اور آٹے کی ایک گڑیا بنا دو۔ اس کا سائز اور صورت شکل بالکل میرے برابر اور مجھ جیسی ہو۔

مضبوط بھی کافی ہونی چاہیے تاکہ چھونے سے بگڑنے نہ پائے۔"

قادرہ نے اس کیک کی گڑیا کو ایک لمبی سی ٹوکری میں رکھ لیا۔ شادی ہوجانے کے بعد جب جہیز کا سارا سامان شہزادے کے محل میں گیا تو دُلہن کے سامان کے ساتھ اس کی گڑیا بھی گئی۔ قادرہ نے محل میں اس گڑیا کو اپنا شادی کا لباس پہنا دیا اور پھر اسے مسہری پر لٹا دیا۔ مچھردانی کے اندر لیٹی ہوئی یہ گڑیا اصلی دُلہن معلوم ہوتی تھی۔ قادرہ خود کمرے میں ایک طرف کونے میں چھُپ گئی۔ خاموشی سے وہ انتظار کرتی رہی کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔

دُولھا میاں چہل قدمی کرتے ہوئے دروازے سے داخل ہوئے۔ قادرہ نے دیکھا کہ وہ مسہری کے پاس گیا اور اس پر لیٹی ہوئی شکل کو غور سے دیکھا۔ پھر اس نے میان سے ایک خنجر نکالا۔ قادرہ کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ دُولھا نے خنجر کی نوک دُولہن کے جسم میں پیوست کردی۔

اس کے بعد یہ دیکھ کر قادرہ کو حیرت ہوئی کہ دُولھا میاں کے رُخسار پر آنسوؤں کی دھار بہہ رہی ہے اور وہ بہت ہی مغموم اور خاموش ہے۔ آنسوؤں کی وجہ سے وہ ٹھیک سے دیکھ نہ سکا اس لیے کہ وہ طیش کی وجہ سے اُسے دکھائی نہ پڑا کہ کیک کی شکل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہیں۔ ایک چھوٹا ٹکڑا بھی مچھردانی سے باہر آگیا اور وہ ٹھیک اس کے مُنھ میں آکر گرا اور اُس نے جو اس کو چکھا تو میٹھا محسوس ہوا۔

شہزادے نے چیختے ہوئے کہا "ہائے قادرہ، میری پیاری قادرہ! آخر تم نے یہ میرے ساتھ کیا کیا؟ جب تم زندہ تھیں تو کڑوے الفاظ مُنھ سے نکالتی تھیں۔ اب جب کہ تم مرچکی ہو تو تم میں کتنی مٹھاس ہے۔ ہائے یہ میں نے کیا کیا؟" پھر آنسوؤں سے اس کے رُخسار تر ہوگئے۔

اس قدر ماتم کرتے دیکھ کر قادرہ کا مغرور دل بھی پگھل گیا۔ شہزادے کی محبت

اس کے دل میں اُبھر آئی - وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی اور پردے کے پیچھے سے باہر نکل آئی پھر اس نے شہزادے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے کہا۔ "پیارے شہزادے! مجھے معاف کر دو - میں بھی تمھاری طرح گھمنڈی اور مغرور تھی - اب جہاں تک کہ میرا تعلق ہے میں تم کو معاف کرتی ہوں حالانکہ اپنے غرور کے نشے میں تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود بہتر یہی ہے کہ آخر میں ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں - اب ہم مل جل کر خوش رہیں اور اطمینان سے زندگی بسر کریں"

فرطِ مسرت سے شہزادے کی چیخ نکل گئی "میری اچھی قادرہ! خدا کرے کہ ایسا ہی ہو"

اور خدا کا شکر ہے کہ پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ابوالہول کا خواب

ایک نوجوان شکاری جو اعلیٰ اور شریف گھرانے کا تھا ایک دن صحرائے اعظم کی ریت پر گھوڑا دَوڑا رہا تھا۔ یہ ہزاروں سال پہلے کی بات ہے لیکن اس وقت بھی مصر کے بادشاہ شیوپ کا مقبرہ، جسے عظیم اہرام کہتے ہیں، کافی پُرانا ہو چکا تھا۔

کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ چٹان کی بنی دیو نُما شکل 'ابوالہول' کتنے دنوں سے شاہی مقبرے کی دیکھ بھال کے لیے ریت میں ایک طرف اٹی پڑی تھی۔ طوفان کے تھپیڑوں نے اس پر ریت ہی ریت پاٹ دی تھی یہاں تک کہ شکل قریب قریب ڈھک گئی تھی۔ صرف اس کے شیر جیسے جِسم کی پیٹھ اور اس کا انسان نُما بھاری سر اور چہرہ ابھی دکھائی دیتا تھا جو کہ ریت کی تہوں سے باہر نکلا ہوا تھا۔

نوجوان شکاری، جس نے ابوالہول کا عجیب و غریب خواب دیکھا تھا، اس کا نام تھاتھمس تھا۔ یہ نام مصر کے ایک قدیم دیوتا کے نام سے ملتا تھا۔ اس قدیم دیوتا کا نام، یعنی اصلی نام 'تھاتھو' تھا اور یہ چاند کا دیوتا تھا۔ تھاتھمس کا حُسن بھی چاند کے حُسن سے ملتا تھا۔ 'تھاتھ' جادو کی کتابوں کا بھی خدا سمجھا

جاتا تھا۔ اسی کی طرح تھاتھمس بھی اپنی عقل اور فراست کا کوئی جواب نہیں رکھتا تھا۔

اس زمانے میں مصر میں سبھی لوگ تھاتھمس کے مدّاح تھے۔ اس کی قدر کرتے اور اسے مانتے بھی بہت تھے۔ بڑے گھرانوں میں یہ مشہور تھا کہ ملک کا اگلا بادشاہ وہی ہوگا۔ بُوڑھا بادشاہ 'امن ہاتپ' ابھی صحت مند تھا لیکن اپنا وارث مقرر کرنے میں اسے زیادہ دیر نہیں تھی۔ تھاتھمس بھی چاہتا تھا کہ اگلا بادشاہ اسی کو چُنا جائے۔ اگرچہ جوانوں کی کمی نہیں تھی اور بہادری میں بھی وہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور بادشاہ بننے کا ارمان ان میں سے کئی ایک کو تھا۔

لیکن تھاتھمس کی بہادری کی کچھ اور ہی بات تھی۔ جنگ و جدل میں کوئی اس سے جیت نہیں سکتا تھا۔ جب وہ شکار کھیلنے نکلتا تو ہوشیار سے ہوشیار ہرن بھی اس کے تیز گھوڑے سے بچ کر آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ ریگستان میں شکار کھیلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا اور کمال کی بات یہ ہے کہ شکار کھیلنے بھی وہ اکثر تنہا ہی جاتا، یہاں تک کہ کسی غلام کو ساتھ نہ لیتا۔

ایسے ہی تنہا شکار کھیلنے کے دَوران تھاتھمس نے ابوالہول کا عجیب و غریب خواب دیکھا تھا۔ ایک دن دھوپ تیز تھی۔ سورج کی تیز کرنوں سے ریگستان تپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ جواں مرد شکاری بھی تپش اور آنچ سے پریشان ہو اُٹھا۔

اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا جب تھاتھمس عظیم اہرام کے قریب پہنچا تو وہاں بھی اسے کسی درخت کا سایہ نہیں ملا۔ گرمی سے اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے اسے سکون مل جائے لیکن درخت کہیں دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سورج کی گرمی سے جب ریت بُھن رہی ہو اور فضا میں اس قدر خُشکی ہو تو بھلا درخت تو درخت کوئی معمولی سا پَودا بھی کیسے اُگ سکتا تھا۔

اتنے میں اچانک نوجوان سوار نے دیکھا کہ عظیم پتھر کے بنے ابوالہول کا سایہ ایک طرف زمین پر پڑ رہا ہے۔

"یہاں ہم تھوڑی دیر آرام کر سکتے ہیں" نوجوان نے زور سے آواز نکال کر کہا تاکہ اس کا گھوڑا بھی سمجھ جائے۔ قریب پہنچ کر اس نے گھوڑے کو لگام دی اور روکا۔ اور پھر اس نے ابوالہول کے سایے میں اپنی سفید چادر پھیلا دی۔ جیسے ہی وہ لیٹا تو چٹان کی بنی دیو نُما شکل کے متعلق بہت سی باتیں اور قصے کہانیاں اسے یاد آنے لگیں۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ بچہ تھا اور پہلی بار ابوالہول کی کہانی کسی نے سُنائی تھی تو وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ کہانی یونان کی تھی.... یونان ایسا ملک تھا جو بحرۂ روم سے آگے دوسری طرف کہیں دُور واقع تھا۔

قدیم زمانے میں جب کہ یونان کے دیوتا زمین پر چلتے پھرتے تھے تو اُن دنوں ابوالہول دراصل ایک دیوتا یا بھاری بھرکم جانور تھا۔ لوگ اس سے بہت خائف رہتے۔ کہیں اور ذکر آتا تو ڈر کر بہت چُپکے سے اس کا نام لیتے تھے۔

یونانیوں کا کہنا تھا کہ ابوالہول کا جسم شیر کے مانند تھا۔ پنجے بھی شیر جیسے تھے اور اس کی دُم بھی۔ اس کے پَر چڑے کے پَر سے ملتے جُلتے تھے۔ سر عورت کے سر جیسا تھا۔ اس دیو ہیکل جانور کا کام یہ تھا کہ تھیبس شہر کی حفاظت کرے۔ ایک اُونچی سی پہاڑی سے وہ سب پر نگاہ رکھتا۔ اِدھر آنے والوں کو وہ اکثر روک دیتا اور چیخ چیخ کر ان سے سوال کرتا۔

"اس پہیلی کو بُوجھو ورنہ شہر میں تم داخل نہیں ہو سکتے"

اسی قسم کی ایک کہانی تھا تمس کو یاد آئی۔

'وہ کون سا جانور ہے جو صبح کو اپنے چار پنجوں پر چلتا ہے؟ دوپہر کو دو پنجوں پر؟ اور رات میں تین پنجوں (پیروں) پر؟'

تھاتھمس کانپ اُٹھا جب اسے یہ خیال آیا کہ جتنے مسافر صحیح جواب نہیں دے پاتے ہوں گے۔ ان میں سے بہتوں کو اس جانور نے مار دیا ہوگا۔ لیکن یہ بھی کمال ہے کہ اوئی ڈی پس کتنا بہادر تھا۔ یہ وہی ہیرو تھا جو ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر نکلا تھا اور اس نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے وطن کی سرزمین کو ابوالہول سے پاک کرے گا۔ تھاتھمس کو یاد آیا کہ ابھی جب کہ وہ لڑکا ہی تھا اور اوئی ڈی پس کا نام سُنتا تھا تو اسے کتنی خوشی ہوتی تھی اور وہ بار بار تالیاں بجاتا تھا۔

اوئی ڈی پس نے چیخ کر جواب دیا تھا کہ "اے ابوالہول! اس جانور کو انسان کہتے ہیں۔ اپنی زندگی کی صبح میں جب کہ وہ بچّہ ہوتا ہے تو وہ اپنے چاروں پنجوں پر رینگتا ہوا چلتا ہے۔ جب دوپہر ہوتی ہے یعنی وہ بڑا ہوتا ہے تو اپنے دونوں پیر پر چلتا ہے۔ شام کے وقت یعنی بڑھاپے میں سہارے کے لیے اس کا ڈنڈا اس کے تیسرے پَیر کا کام دیتا ہے۔"

یہ جواب سُن کر ابوالہول چکرا گیا اور حیران ہوا کہ اب کیا کرے۔ بہادر اوئی ڈی پس کی چمکیلی تلوار سے وہ اتنا ڈرا کہ جان بچانے کے لیے پہاڑی سے اُتر کر تیزی سے بھاگا۔ جلدی میں وہ چٹانوں سے ٹکرا گیا اور وہیں پر اس کی مَوت واقع ہوئی۔ اس طرح تھیبس شہر کو اس سے نجات ملی۔

لیکن اس کا اِتنا رعب تھا کہ مرنے کے بعد بھی بحرۂ روم کے چاروں طرف کے ملکوں کے لوگ اس کی کہانیاں سُناتے تھے۔ سبھی لوگ یہ کہتے تھے کہ اس سے خوفناک سنتری آج تک نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ تو اس کی پرستش کرتے تھے اور اپنی حفاظت کے لیے اس کو یاد کرتے تھے۔ پتھر سے ابوالہول کی شکل بناتے تھے۔ اسی کی دیکھا دیکھی مِصر اور یونان کے قدیم مقبروں کے نزدیک ابوالہول کا ایک بُت بنایا جاتا تھا تاکہ کوئی بَلا مقبرے کے قریب نہ آئے اور چور ڈاکو بھی دُور ہی دُور رہیں۔

اس طرح مقبرے کے اندر جو خزانے ہوتے ان کی حفاظت ہوتی اور دوسری دُنیا میں پہنچ کر خزانے کے مالک کو اطمینان رہتا اور اس کی رُوح کو سکون ملتا۔

اس ابوالہول کا سخت چہرہ دیکھ کر تھاتھ مس کو یہ سب قصّے یاد آئے۔

"عظیم ابوالہول" اس نے چیخ کر کہا "مجھے بھی تم اپنی حفظ و امان میں لے لو اور میری قسمت کے محافظ بن جاؤ جیسے کہ شیوپ کے عظیم اہرام کے تم محافظ ہو۔ میرے اوپر بھی تم مہربان ہو جاؤ۔ بادشاہ امنِ ہاتپ کے دماغ میں تم میرا نام ڈال دو تاکہ وہ مجھے اپنا جانشین بنا لے اور اس کے انتقال کرنے کے بعد میں ہی مِصر کا فرمانروا بن جاؤں"

لیکن پتھر کے بنے بُت کے مُنھ سے کوئی آواز نہیں آئی۔

اتنے میں جوان شہزادے کو یاد آیا کہ وہ زمانہ گیا جب کہ ابوالہول

انسانوں سے باتیں کرتا تھا۔ اُسی وقت وہ لیٹ گیا اور فوراً ہی اسے نیند آگئی۔

تھاتھمس پھر کیسے جاگا؟ کیا وہ واقعی اندر بیٹھا تھا؟ دماغ پر زور ڈالنے سے اسے یاد آیا کہ اس نے شاید کوئی خواب دیکھا تھا کہ پتھر کے بنے دیو کا چہرہ اس کی طرف مُڑ گیا ہے اور اس کے مُنہ سے آواز آرہی ہے:

" مصر کے شہزادے تھاتھمس! مجھے بتاؤ۔ کون اس سرزمین کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ غور سے سُنو۔ میری طاقت میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اگرچہ مجھے انسانوں نے بُھلا دیا ہے۔ ریت کو دیکھو کہ کس طرح اس کے ذرّوں نے میرے شیر نُما جسم کو ڈھک دیا ہے۔ کیا کسی کو یاد ہے کہ میری طاقت خوفناک سے خوفناک جانور سے کم نہیں تھی۔ اِس وقت صرف میرا سر دکھائی دیتا ہے اور اتفاق کی بات یہ کہ دیکھنے میں وہ ایک کمزور انسان کا سر معلوم ہوتا ہے۔

تم تھاتھمس! وعدہ کرو کہ میرے جسم سے ساری ریت ہٹا دو گے اور مجھے باہر نکلنے میں مدد کرو گے تاکہ میری پوری اور اصلی شکل سب کو دکھائی دے۔ پھر مصر تمھارا ہوگا اور تمھیں اس پر حکومت کرو گے۔ شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب، ہر طرف تمھارا ہی طوطی بولے گا۔ تمھارے دَور میں خوشحالی بڑھے گی اور ہر طرف سے دولت اور خوشی کھنچ کھنچ کر تمھاری سلطنت میں آئے گی لیکن دیکھو ریت کو پہلے ہٹانا ہے تاکہ میری شان دوبالا ہو جائے اور میں سب کو پھر دکھائی دینے لگ جاؤں "

شہزادہ جب اُٹھا اور اُٹھ کر گھر کی طرف لوٹا تو اس کے کانوں میں ابوالہول

کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ اس نے جواب دے دیا ہے اور ابوالہول سے پکا وعدہ کر لیا ہے لیکن اسے شک بھی پیدا ہوا کہ جو کچھ کہ اس نے دیکھا تھا کیا یہ سب خواب ہی خواب تھا یا اس کی کچھ حقیقت بھی تھی۔

گھر جا کر وہ جلد ہی لوٹ آیا اور جلدی جلدی ابوالہول کے چاروں طرف سے ریت کو اس نے ہٹانا شروع کر دیا۔ ریت کے ٹیلے تہہ بہ تہہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کو ہٹانا اور صاف کرنا تنہا اس کے بس کا نہ تھا۔ اس نے اپنے غلاموں کو بُلایا جو کافی دنوں تک ریت صاف کرتے رہے۔ چٹان کے بنے دیو کا قد بہت لمبا تھا۔ اتنا لمبا جتنا کہ اوپر نیچے تیس لمبے آدمیوں کا قد۔ اس لیے کافی دنوں تک محنت کرنے کے بعد ریت کے ٹیلے ہٹے۔

آخر کار اس کا سارا جسم ریت سے باہر نکل آیا۔ شیر کی دُم کے کنارے سے لے کر پیر کے پنجوں کے ناخن تک۔ اب ہر شخص اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ابوالہول نے اپنا وعدہ پورا کیا؟ سب عالموں کا کہنا ہے کہ وقت گزرنے کے بعد تھاتھ مس مصر کا بادشاہ بنا۔ اس نے حکومت کا انتظام اچھی طرح چلایا۔ اس کی رعایا خوش رہی۔ کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ گویا یہ ابوالہول کے خواب کی سچی تعبیر تھی۔

تھاتھ مس کی آرزو اور تمنا پوری ہوئی لیکن اگر تھاتھ مس وہ خواب نہ دیکھتا تب بھی کیا یہی سب کچھ ہوتا؟ اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ بھلا ہم میں سے کون ہے جو اس کے متعلق پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے۔

ان دنوں مصر کے اس ابوالہول کے پنجوں کے درمیان ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا ہے۔ اس مندر کے اندر ایک پتھر کا ستون ہے جس پر یہ کہانی کھُدی ہوئی ہے بالکل ویسے ہی جیسے کہ اوپر آپ کو بتائی جا چکی ہے۔

جادُو کا کچھوا

"ابن الفریح! ایک کہانی سُناؤ۔ پُرانی کہانیوں میں سے کوئی ایک سُنا دو۔"
ابن الفریح چلتا پھرتا ایک مسافر تھا۔ اور جب کبھی وہ قاہرہ میں ہوتا تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ کہانیاں سُنانا اس کا مشغلہ تھا۔ قاہرہ کے جس گھر میں وہ چاہتا، دروازہ کھٹکھٹا کر اندر گھُس جاتا اور گھر کے لوگ جس حالت میں بیٹھے ہوتے اُسی حالت میں اسے اندر بُلا لیتے۔ اپنے ساتھ بٹھاتے اور دائرہ بنا کر بیچ میں تانبے کی کشتی رکھ دیتے۔ اس میں کھانا ہوتا اور سب لوگ مل کر ایک ساتھ کھاتے۔ گرم گرم چاول اور بھُنا ہُوا گوشت جب ختم ہو جاتا تو ہر ایک اطمینان سے بیٹھ جاتا اور ابن الفریح پھر اپنی کہانی شروع کرتا۔

"آج رات کو میں ایک عجیب و غریب کہانی سُناؤں گا۔ قدیم زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے ایک لڑکے نے کچھوے سے شادی کی جیسے کہ آج ہم سب لوگ چھت پر بیٹھے ہیں اسی طرح ایک خاندان بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ اور اس کے تینوں لڑکے جمع تھے۔ جب صبح ہوئی اور سورج نکلا تو تینوں شہزادے ہَوا میں دھڑا دھڑ تیر چلانے لگے۔ اُس زمانے کا دراصل یہ رواج تھا کہ جو شادی کرنا چاہتا تھا وہ اسی طرح تیر چلاتا اور اسی بہانے اپنی دُلہن کو پسند کرتا۔

تیر کا ذکر سُنتے ہی لڑکوں کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ دُلہن کا لفظ سُن کر نوعمر عورتیں اور نئی نویلی لڑکیوں نے گُدگُدی محسوس کی۔ بہرحال سب خاموش تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہانی سُنانے والے کی آواز میں کوئی جادو ہے اس لیے سب اپنے اپنے جذبات دبائے بیٹھے رہے۔

پُرانے زمانے میں مِصر میں ایک سُلطان تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ گئے تو اس نے سب کو بُلا کر کہا۔

"میرے بیٹو دیکھو! تم لوگوں کو اپنی اپنی دُلہن چُننا ہے۔ کل سورج نکلتے ہی ہم لوگ محل کی چھت پر جمع ہوں گے اور تم میں سے ہر ایک شہر کے اوپر سے تیر چلائے گا۔ تیر جہاں جاکر گرے گا وہاں تمھیں ایک لڑکی ملے گی اور پھر اُسی لڑکی سے تمھیں شادی کرنی ہوگی۔"

یہ خبر سُنتے ہی قاہرہ میں ہل چل مچ گئی۔ تیر چلانے سے پہلے سب لوگ محل کے آس پاس اپنی اپنی چھتوں پر اکٹھا ہو گئے تاکہ ٹھیک سے وہ تماشہ دیکھ سکیں۔ ان میں کئی ایک جوان لڑکیاں بھی تھیں جن کے دل میں ارمان تھا کہ کاش تیر ان کے پاس پہنچ جائے۔

بادشاہ کے سارے وزرار اور دوسرے اعلیٰ افسران چھت پر جمع تھے۔ اس کے تینوں لڑکے محمود، مینا اور میرزا تھے۔ پاس میں غلام تیر کمان لیے کھڑے تھے۔

پہلے محمود کی باری تھی۔ وہ سب سے بڑا تھا۔ اس نے اپنی کمان دُرست کی۔ جیسے ہی اس نے تیر چلایا تیر ایک دائرہ بناتا ہوا چھتوں کے اوپر سے نکل گیا۔ وہ جاکر وزیرِ اعظم کی چھت پر گرا۔

"دیکھو کہاں تیر پہنچا۔ خدا کی بڑی عنایت ہے کہ وزیرِ اعظم کی لڑکی سے

سلطان کے لڑکے کی شادی ہوگی۔ شہزادے کی قسمت بہت اچھی ہے۔ سب درباری بڑے خوش تھے۔

اس کے بعد منجھلے لڑکے مینا نے اپنی کمان سنبھالی۔ تیر کمان سے نکل کر دُور اوپر سے نیچے ہوتا ہوا ایک چڑے کے مانند نکل گیا۔

تیر جا کر سپہ سالار اعظم کے گھر پر گرا۔ سب لوگ اس گھر کو پہچانتے تھے۔ جنرل کی لڑکی شریف گھرانے کی تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس شہزادے کی قسمت بھی اچھی تھی۔

لیکن جب میرزا، سب سے چھوٹے لڑکے کی باری آئی تو کسی نے تالی نہ بجائی۔ اس کا تیر جس چھت پر جا کر گرا وہ کوئی بہت معمولی سا گھر تھا۔ قاصدوں کو بھیج کر معلوم کیا گیا تو پتہ چلا کہ اس گھر میں کوئی لڑکی ہی نہیں ہے البتہ ایک جوان کچھوا ہے جس کی دیکھ بھال غلاموں کے سپرد ہے۔

"بادشاہ سلامت! غلام سب اس کچھوے کو شہزادی کہتے ہیں۔ وہ اس طرح اس کے ساتھ پیش آتے ہیں گویا کہ وہ ایک انسان ہے۔ لیکن کچھوا بہرحال کچھوا ہے۔"

"کچھوے سے بھلا میرے لڑکے کی شادی ہوگی! نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔"

سُلطان سخت پریشان تھا۔ "میرزا تم ایک بار تیر اور چلاؤ اور خدا کرے کہ اب کی دفعہ تمھارا تیر کہیں دوسری جگہ پہنچے۔"

شہزادے نے تیر کو آسمان کی طرف پھینکا۔ تیر شہر کے اوپر سے چکر لگاتا ہوا نکل گیا۔ لیکن وہ اسی معمولی چھت پر جا کر گرا۔

"میرزا میرے بیٹے! تیسری بار پھر کوشش کرو۔" سلطان کو یقین نہیں آتا تھا کہ کیا خدا نے اس کے بیٹے کی قسمت میں کچھوا لکھا ہے۔ اس زمانے میں

لوگوں کا اعتقاد تھا کہ مصر کے دیوتا کبھی کبھی جانوروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں لیکن ایک شہزادہ کچھوے سے شادی کرے یہ بات ہر ایک کی سمجھ سے باہر تھی۔

" بہرحال حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے۔تیسری بار بھی تیر چمکیلے بھورے کچھوے کی چھت پر آکر گرا۔

" اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی مرضی نہیں ہے کہ تمھاری شادی ہو" سلطان کی آواز میں خفگی تھی لیکن شہزادہ تیار نہیں تھا۔

" خدا کی یہی مرضی ہے۔ میں نے تین بار تیر چلایا اور ہر بار تیر اُسی چھت پر جاکر گرا۔ مجھے انکار نہیں اور میں کچھوے کو اپنی دُلہن بناؤں گا۔"

بڑے لڑکے اور منجھلے لڑکے کی شادیوں میں خوب دُھوم دھام رہی اور دعوتیں بھی زوردار ہوئیں۔ تین دن تک لوگ متواتر گاتے رہے، ناچتے رہے اور عمدہ سے عمدہ کھانا کھا کر خوشی مناتے رہے۔ ان کے برخلاف میرزا کی شادی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ دونوں بڑے شہزادوں کی دُلہنیں شریک نہیں ہوئیں۔ بادشاہ کا کوئی درباری بھی مدعو نہیں تھا۔ اگر کوئی شادی کا ذکر بھی کرتا تو چُپکے سے۔

سُلطان اس قدر پریشان تھا کہ اس نے کھانا پینا بند کر دیا۔ اس نے دربار میں آنا جانا بند کر دیا۔ بستر میں سرگاڑے دن بھر پڑا رہتا۔ اسے سخت کوفت تھی۔ وہ بیمار پڑ گیا اور کھانا پینا بند کرنے کی وجہ سے وہ دن بہ دن کمزور ہوتا چلا گیا۔

" یہ تو زیادتی ہے۔ کھانا آپ کو نہیں ترک کرنا چاہیے۔"

اس کا بڑا لڑکا محمود ڈرتا تھا کہ کہیں بادشاہ خدانخواستہ رحلت نہ کر جائے۔

" میری بیوی خاص قِسم کا کھانا آپ کے لیے بنائے گی۔ وہ ایک میمنہ بھُون کر بریانی بنائے گی اور آپ کو یہ بہت پسند آئے گی۔"

منجھلا لڑکا مینا بھی بھلا کیوں پیچھے رہتا۔ اُس نے کہا: " ابا جان! میری بیوی

آپ کے لیے چوزے کا اِسٹو بنائے گی جو اتنا مزے دار ہوگا کہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔ اگر آپ اسے تناول فرمائیں گے تو رفتہ رفتہ آپ کی صحت سنبھل جائے گی۔"

"میری دُلہن بھی آپ کے لیے کھانا بنائے گی ابا جان!" میرزا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا کچھوا نہ تو ہوشیار تھا نہ دولت مند جیسے کہ اس کی دونوں بھابیاں تھیں۔ میرزا کو خود بھی اپنی بیوی کے بارے میں بہت کم معلوم تھا حالانکہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔

"جو کچھ کھانا میرے لڑکے بھیجیں گے میں چکھوں گا۔" سلطان نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ میں کچھ کھا نہیں سکوں گا۔"

"بہرحال تم لوگ کھانا بنوا کر ٹرے میں بھیج دو۔" اس نے حکم دیا۔ "جس

کے کھانے سے میری طاقت واپس آئے گی اس کی دُلہن کو میں بہت سا انعام و اکرام دوں گا۔"

دونوں شہزادیاں خوش تھیں کہ کم سے کم اپنے خُسر کی خدمت کرنے کا ان کو ایک موقع تو مِلا۔ اگرچہ دونوں بڑے لڑکے میرزا کا مذاق اُڑانے سے باز نہیں آئے۔

"اوہ! اوہ! ہا! ہا!" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولے "کچھوا کیا کھانا بناکر دے گا دیکھنا ہے۔"

میرزا نے طنز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بھاگ کر وہ جلدی سے گھر پہنچا اور اپنی دُلہن سے اس نے کہا کہ سُلطان کے لیے ٹرے میں سجا کر شام کو عمدہ قسم کا کھانا بھیجنا ہے۔ کچھوے کے گھر میں کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ کچھوے نے ایک غلام زادی کو اپنی جیٹھانیوں کے پاس بھیجا تاکہ کچھ تو ان کی مدد مل جائے۔

"میمنہ کے کان، ناک اور دُم ہمیں بھیج دو۔" نوکرانی نے محمود کی بیوی سے گزارش کی۔ "چوزے کی ٹانگ اور پَیر ہمیں دے دو۔" مینا کی بیوی سے کچھوے کی غلام زادی نے درخواست کی۔ لیکن کچھوے کی نوکرانی کو دیکھتے ہی دونوں جیٹھانیوں نے دھڑا دھڑ اپنے دروازے بند کر لیے اور تڑ سے بولیں۔

"ہم تمھاری بالکل مدد نہیں کر سکتے۔"

بہرحال مقررہ وقت پر انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تینوں ٹرے بادشاہ کے پاس لائی گئیں۔

سب سے بڑے لڑکے کی بیوی کی ٹرے کو کھولا گیا۔ اُف! اوہ! اوہ! گنبد نُما چاندی کا ڈھکن ہٹاتے ہی بُو سی نکلی۔ بچّے کا گوشت سڑ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ ایک برس کا پکا ہوا ہے۔ چاول بھی خراب۔ اس پر مٹّی پڑی ہوئی گویا کہ

چوہوں نے اسے ملیامیٹ کر رکھا ہو۔

سُلطان بے ہوش ہوتے ہوتے بچا اور اس نے چیخ کر کہا: "ہٹاؤ اسے لے جاؤ۔"

منجھلے لڑکے کی بیوی کی ٹرے بھی ویسی ہی نکلی۔ چوزے کا شوربہ اور اسٹو سڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور مکھن کی مہک عجیب سی آرہی تھی۔

"میرے بیٹے کیا تم لوگ مجھے مارنا چاہتے ہو؟"

اس نے حکم دیا کہ دوسری ٹرے کو بھی فوراً کمرے سے باہر پہنچایا جائے۔

"بس کافی ہوگیا۔" سُلطان نے مایوس ہوکر کہا: "اب میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی میرے لیے کافی ہے۔"

بیمار بادشاہ نے پہلے تو اس کھانے کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں سمجھا جو کہ اس کا تیسرا بیٹا میرزا لایا تھا لیکن شہزادے نے ضد کی اور منت سماجت کی کہ کم سے کم اس کی بیوی کی ٹرے کو کھول کر تو دیکھ لے۔

یہاں کہانی کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ جب چاندی کا ڈھکن اُٹھایا گیا تو تازے تازے گرم کھانے سے بڑی عمدہ خوشبو نکلی۔ ہر ایک کے مُنھ میں پانی آگیا۔ مریض سلطان اُٹھ بیٹھا اور اپنے ہونٹ چاٹنے لگا۔ نرم نرم گوشت، چاول اور چٹنی کھاتے ہی اس کی طاقت واپس آگئی اور وہ اُٹھ بیٹھا۔

سارے درباری خوش ہوگئے کہ ان کا سلطان صحت مند ہوگیا اور اب کوئی فکر نہیں۔ جشن منانے کے لیے شاندار دعوت کا انتظام کیا گیا۔ تینوں لڑکوں اور اُن کی دلہنوں کے لیے کھانے کی میز پر مخصوص جگہیں مقرر تھیں۔

جشن سے ایک دن پہلے چھوٹے کی غلام زادی نے اپنی دونوں جیٹھانیوں کے دروازے پھر کھٹکھٹائے۔

"میری مالکن نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کل دعوت میں وہ چاہتی ہیں کہ ذرا شان دار طریقے سے جائیں" اس نے محمود کی بیوی سے کہا۔ "انھوں نے کہا ہے کہ اپنا بکرا ذرا براہِ کرم دے دیجیے تاکہ کوئی سواری تو ان کے پاس ہو جس پر وہ سوار ہو کر جا سکیں"

لیکن محمود کی بیوی نے صاف انکار کر دیا۔ "جادو منتر سے کچھوے نے سُلطان کے لیے سب سے اچھا کھانا بنا کر بھیج دیا تھا" اس نے سوچا۔ "میں اس کی مدد کیوں کروں؟ مجھے تو خود بکرے کی ضرورت ہے اور میں اس پر سواری کروں گی"

اس کے بعد نوکرانی دوسرے لڑکے مینا کے گھر گئی۔

"میری مالکن کے پاس سُلطان کی دعوت میں جانے کے لیے سواری کا کوئی انتظام نہیں" نوکرانی نے کہا۔ "انھوں نے کہا ہے کہ آپ اپنی ہلکی بھُورے رنگ والی بطخ دے دیجیے تاکہ وہ اس پر بیٹھ کر جا سکیں"

"کچھوے سے کہنا کہ میں خود ہلکی بھُوری بطخ استعمال کروں گی" مینا کی بیوی نے بھی محمود کی بیوی کی طرح سوچا کہ اس میں ضرور کوئی چال اور جادو ہے ورنہ کچھوے کو بطخ کی کیا ضرورت تھی۔

دعوت کے دن سلطان کے محل کے پھاٹک پر بھیڑ جمع تھی۔ سب چاہتے تھے کہ دیکھیں مہمان کس کس طرح بن سنور کر یا سج دھج کر آتے ہیں۔

"دیکھو وہ ایک سواری آرہی ہے" سب نے چیختے ہوئے کہا۔

سڑک پر گرد کا ایک بادل سا چھا گیا تھا۔ سواری جب قریب آئی تو قہقہے سے فضا گُونج اُٹھی۔ ایک ہلکے بھُورے رنگ کی بطخ ٹِک ٹِک کرتی ہوئی محل کے پھاٹک کی طرف گھسٹتی ہوئی آرہی ہے۔ اس کی پیٹھ پر مینا کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔

سُلطان ایک کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے بہت غصّہ آیا۔ اس کے لڑکے کی بیوی نے اپنا کیا مذاق بنایا ہے۔

اتنے میں گرد کا دوسرا بادل دکھائی دیا۔ محمود کی بیوی اپنے بکرے کی پیٹھ پر بیٹھی چلی آرہی ہے۔ سُلطان اپنے لڑکوں کی بیویوں کو سخت سُست کہنے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں میں میٹھے میٹھے گانوں کی آواز سُنائی دی۔ دس آدمی اپنے کندھوں پر ایک سُنہری کُرسی اُٹھائے چلے آرہے ہیں۔ ساٹن کے کپڑوں میں ملبوس اس پر ایک حسین و جمیل شہزادی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ گُلاب کی مانند کھلا ہوا ہے۔

"یہ میں ہوں کچھوا! تمھارے لڑکے میرزا کی دُلہن" یہ لڑکی نے بادشاہ کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

ہر ایک حیران تھا۔ سخت حیران!

یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

جب کھانے کی میز پر سب بیٹھے وہاں جو جادُو پیش آیا اسے دیکھ کر ہر ایک ششدر رہ گیا۔ انواع و اقسام کے کھانے آئے۔ آخر میں میٹھے چاول کا زردہ آیا۔

کچھوے والی شہزادی نے ایک مُٹھی بھر کر چاول اُٹھا لیے۔ گیہوں کے دانوں کی طرح اس نے اپنے سر پر چاول چھڑک دیے۔ سر پر گرتے ہی ہر ایک دانہ ایک قیمتی ہیرا بن گیا۔ منٹوں میں اس کے بال موتی، جواہر اور زمرد سے پَٹ گئے۔

سُلطان کی دوسری دونوں بہوئیں سمجھیں کہ وہ بھی یہ جادُو دکھا سکتی ہیں۔ انھوں نے نقل اُتاری۔ لیکن جیسے ہی انھوں نے چاول اپنے سروں پر چھڑکے تو وہ ان کے بالوں میں چپک گئے۔ ان کے بال لَت پَت ہوگئے۔ گھی سے ان کے لباس بھی گندے ہوگئے۔ گھبرا کر ان کو دعوت کے ہال سے اُٹھ کر بھاگنا پڑا تاکہ وہ اپنے اپنے کپڑے صاف کرسکیں۔

عوام کو اس طرح معلوم ہوگیا کہ کچھوے والی شہزادی اللہ کی چہیتی اور پیاری بندی ہے۔

اس نے پھر سب کو بتایا کہ شیطان کے جادُو کی وجہ سے وہ کچھوے کی شکل میں رہتی ہے۔ سب متحیّر اور حیران تھے۔ سب کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

شور شرابے اور چیخ پُکار کے درمیان وہ سُلطان سے مخاطب ہوئی اور اس نے کہا۔

"آپ کے لڑکے میرزا کے شبہہ رنج وغم کی وجہ سے میں شیطان کی بد دعا سے آزاد ہوگئی۔ میرے جادُو کا کمال یہ تھا کہ اگر سُلطان مجھے اپنے لڑکے کی دُلہن کی حیثیت سے بُلائے گا تو میں اس صورت میں اپنا اصلی رُوپ اختیار کرسکوں گی"

کچھوے والی شہزادی اور اس کا شوہر جب اپنے گھر واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں نقشہ بدلا ہوا ہے۔ ان کے گھر کی جگہ ایک عالی شان محل کھڑا ہے جو اتنا ہی خوشنما ہے جتنا کہ خود سلطان کا محل۔ اس کے باغ سے کسی چیز کے جلنے کی مہک آرہی تھی۔ کچھوے کی کھال آگ پر رکھی ہوئی تھی۔ اب اسے کبھی بھی بھورے رنگ کی گنبد میں اپنے آپ کو چھُپانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پیسہ ہضم، کہانی ختم!!

لیکن کہانی سُننے والوں نے ابوالفریح سے کچھ سوالات پُوچھے۔

"بھلا یہ کیسے ہوا کہ میرزا کا تیر تینوں بار کچھوے ہی کی چھت پر گرا؟"

"اس کا راز تو پتہ نہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے" کہانی سُنانے والے نے اپنا سر ہلایا "خدا عظیم ہے، خدا مہربان ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسی کی کچھ کرامات تھیں کہ میرزا کے تینوں تیر کچھوے کی چھت پر گرے"

لڑکی (حلیمہ)
جو غزالوں کے ساتھ رہتی تھی

شمالی افریقہ کے خشک علاقوں میں مُور قبیلے کا ایک گھرانہ تھا۔ اس گھرانے میں کُل تین آدمی تھے۔ باپ، بیٹا اور بیٹی۔ باپ کا نام مفتاح تھا۔ بیٹے کا نام دیمبا اور بیٹی کا نام حلیمہ تھا۔ یہ لوگ مسلمان تھے اور دل کے اچھے تھے۔

باپ، بیٹا دن میں پانچ بار کعبہ کی طرف رُخ کرکے سر جُھکاتے تھے یعنی وہ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ مسجد سے مؤذن کی آواز آتے ہی وہ نماز کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ بیٹی گھر میں رہتی اور وہ کوئی پردہ نہیں کرتی تھی۔ سودا خریدنے کے لیے بے شک وہ بازار جاتی لیکن راستے میں کسی جوان مرد سے وہ بات نہیں کرتی تھی۔

ماں کا انتقال ہو چُکا تھا۔ اُس وقت بھائی بہن چھوٹے تھے۔ اس لیے باپ کے علاوہ کوئی اور ان کی پرورش کرنے والا نہ تھا۔ حالات بالکل ٹھیک تھے اور باپ، بیٹا اور بیٹی ہنسی خوشی رہتے تھے۔ کبھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن مفتاح کو سفر کرنے کے لیے دُور دراز کے ایک قصبے میں جانا پڑا۔

لہ ہرن

دیمبا کی عمر سولہ سال تھی۔ اونٹ کی سواری کے لیے وہ ہوشیار تھا اور اپنے باپ کے اونٹوں کے قافلے کی دیکھ بھال کے لیے وہ سبھی باتیں جانتا تھا۔ حلیمہ کی عمر پندرہ سال تھی اور وہ بھی اپنے بھائی سے کچھ کم نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ایک لڑکی تھی اور اس کو سفر پر لے جانا ذرا مشکل تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اسے گھر پر چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ مفتاح نے کہا: "بٹیا تم گھر پر رہو۔ یہاں کوئی خدشہ نہیں ہے لیکن دروازہ ہمیشہ بند رکھنا۔ مسجد کے مؤذن سے میں کہے جاتا ہوں۔ وہ روزانہ کھڑکی کے پاس آکر تم سے پوچھ لیا کرے گا۔ کوئی کام ہو تو اس سے کرا لینا۔ کھانے کی کمی پڑے تو وہ بھی اس سے منگا لینا۔ وہ چونکہ نمازی ہے اور پکا مسلمان۔ اس لیے اس کا چال چلن ٹھیک ہے۔ بہت نیک خصلت ہے۔ اس سے تمھیں کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے۔"

لیکن مؤذن کے متعلق یہ محض ایک خوش فہمی تھی۔ وہ جوان تھا اور اچھا آدمی نہیں تھا بلکہ وہ تو حقیقتاً بُرا تھا، بہت ہی بُرا۔ وہ حلیمہ کی محبت میں گرفتار تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔ حلیمہ بھی کچھ کم جاذبِ نظر نہیں تھی۔ اس کا رنگ و روپ گندمی، آنکھیں نیلی اور جسمانی لحاظ سے اس کا ہر عضو ایک خاص تناسب میں ڈھلا ہوا تھا۔ اسی لیے حسن میں مور قبیلے کی لڑکیوں میں وہ کوئی جواب نہیں رکھتی تھی۔ مٹھاس اور شان اس میں بہت تھی بلکہ شمالی افریقہ کے پورے علاقے میں کوئی دوسری لڑکی اس کے مدِمقابل نہیں تھی۔

مفتاح کو گئے ہوئے مشکل سے ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ مؤذن نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ وہ حلیمہ سے اصرار کرتا کہ دروازہ کھولو بلکہ وہ تو جھانسے دے کر اسے بھگا لے جانا چاہتا تھا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر کہتا: "خدا کے لیے حلیمہ تم میرے ساتھ آجاؤ۔ تمھارے سامنے میرے لیے یہ مسجد وسجد کچھ نہیں ہے۔ تمھیں اپنی بیوی بنانے کا ارمان ہے۔ تمھارے باپ کب آئیں گے کیا پتہ۔ چلو آج ہی یہاں سے بھاگ چلیں۔"

حلیمہ معصوم تھی لیکن مؤذن کی چال کو وہ خوب سمجھتی تھی۔ وہ کبھی اس کے جھانسوں میں نہیں آنے والی تھی۔ وہ کہتی: "میرے باپ نے حکم دیا ہے کہ میں دروازہ ہرگز نہ کھولوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور نہ جانا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

مؤذن گڑگڑاتا۔ وہ منت سماجت کرتا۔ لڑکی ٹس سے مس نہ ہوتی۔ پھر مؤذن سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ خفا ہو گیا اور اس نے دھمکی دی: "تم کو بعد میں افسوس ہوگا۔ میں تمھارے باپ سے تمھارے متعلق ایسی ایسی کہانیاں گڑھ کر سناؤں گا کہ وہ تم کو مکان سے باہر نکال دے گا اور جان سے مروا دے گا۔ اس وقت تم مجھے یاد کرو گی اور بہت پچھتاؤ گی۔"

حلیمہ نے سختی سے جواب دیا: "تم جو چاہو کہنا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ خدا محافظ ہے۔ میرے باپ ایسے نہیں کہ تمھاری جھوٹی باتوں میں آجائیں۔"

لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ جب مفتاح کا کارواں گھر آتے وقت ابھی قصبہ سے دُور ہی تھا کہ مؤذن اس سے ملنے کے لیے آیا۔ اس بدمعاش نے کہا: "اے مفتاح! خبر اچھی نہیں۔ تمھاری لڑکی حلیمہ نے تمھاری ناک کٹوا دی۔ تمھاری غیر موجودگی میں وہ ہر روز بازار جاتی اور آدمیوں سے کوئی پردہ نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے بالکل ایک ناچنے والی کا وطیرہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے بارے میں چاروں طرف چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔"

خاندان کے نام پر یہ دھبہ تھا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا مفتاح کو اندازہ نہیں ہوا کہ مؤذّن جھوٹ بولتا ہے۔ اس کی بچّی کتنی شریف تھی۔ اس کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتوں پر اس نے کیسے یقین کرلیا؟ یقین کرنے کی بات ہی تھی۔ آخرکار ایک عبادت گزار نے یہ الزامات لگائے تھے۔

طیش میں آکر مفتاح نے اپنے لڑکے دیمبا سے کہا "تم آگے بڑھ کر اپنی بہن کے پاس جاؤ۔ میں اس لڑکی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اسے پکڑ کر تم دُور ریگستان میں لے جاؤ اور وہیں اسے قتل کردو۔ حلیمہ نے ہمارے خاندان کی بڑی بدنامی کرائی۔ آج سے وہ میری لڑکی نہیں۔ تمھارے پاس جو شکاری چاقو ہے اسی سے اسے ختم کردو۔ خون سے تر اس کی پوشاک لاکر مجھے دکھانا۔ جب تک تم اسے قتل نہیں کروگے ہمارے خاندان کی بدنامی دُور نہیں ہوگی۔"

دیمبا کے لیے حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کے آنے پر حلیمہ نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اس نے غصّے سے کہا "ہمارے گھر کے لیے تم ایک دھبہ ہو۔ تمھاری وجہ سے ہماری بڑی بدنامی ہو رہی ہے مؤذّن نے ہم کو ساری تفصیلات بتا دی ہیں۔ باپ نے حکم دیا ہے کہ میں تم کو دُور صحرا میں لے جاکر وہیں تم کو ختم کردوں۔"

غریب بچّی نے روتے ہوئے کہا "مؤذّن جھوٹا ہے۔ دیمبا میرے سگے بھائی! میں نے کوئی بُری حرکت نہیں کی ہے لیکن اگر باپ نے حکم دیا ہے تو ٹھیک ہے۔ میرا سرِ تسلیم خم ہے اور میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

صحرا میں پہنچ کر بھائی کا دل پگھل گیا اور رحم اور محبت سے اُبل پڑا۔ آخر حلیمہ اس کی سگی بہن تھی۔ اس نے چیخ کر کہا "حلیمہ! میرے لیے تم کو مارنا ناممکن ہے لیکن کیا کروں۔ تم کو یہاں صحرا میں چھوڑنا پڑے گا۔ یہاں رہو اور بجز اس کے

کوئی چارہ نہیں کہ تم خدا سے دُعا مانگتی رہو۔ خدا کرے کہ کوئی تمھارا محافظ بن کر آجائے۔ تم کو پینے کے لیے پانی بھی کہیں سے مل جائے اور تم پیاس سے تڑپ نہ سکو۔ میری دُعا ہے کہ تم صحیح و سالم رہو اور آخر میں خدا ایک دن ہم کو ملا بھی دے۔ اب تم مجھے اپنی پوشاک دے دو۔ کسی جانور کو مار کر میں تمھارا لباس اس کے خون میں تر کر لوں گا اور پھر جب باپ دیکھیں گے تو سمجھیں گے کہ یہ تمھارے خون میں لت پت ہے۔"

خشک اور ریتیلے بیابان میں حلیمہ تنہا رہ گئی۔ وہ اِدھر اُدھر ماری ماری پھری۔ بھوکی پیاسی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ مرنے سے اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اگرچہ ابھی تک قسمت اچھی تھی کہ اس کے بھائی نے اپنے شکاری چاقو سے اس کا گلا نہیں کاٹا تھا۔

لیکن ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا کہ غزالوں کی ایک فوج ریت اُڑاتی ہوئی اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔ لڑکی کے پاس پہنچ کر جانور سب جمع ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے خدا نے یہ انتظام کیا ہے۔

یاد رکھو کہ قدیم زمانے میں آدمی اور جانور ایک دوسرے کو کہیں بہتر طریقے سے سمجھتے تھے بمقابلے آج کل کے۔ اور جب لڑکی نے شریف جانوروں کو اپنی کہانی سُنائی تو وہ فوراً اسے اپنی فوج میں شامل کرنے کو تیار ہو گئے۔

"حلیمہ! تم فکر نہ کرو۔ ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمھیں وہ جگہ بتا دیں گے جہاں سے تم کو کھانا مل سکتا ہے۔ پانی جہاں ہے وہاں بھی تمھیں لے چلیں گے۔ اطمینان رکھو ہم تم کو مرنے نہیں دیں گے۔" ان الفاظ میں غزالوں کے سردار نے اس کا استقبال کیا۔ ہرن نے جڑی بوٹیاں لا کر دیں۔ پینے کے

لیے خود اپنا دودھ پیش کیا۔

اس طرح اس کی زندگی بچ گئی۔

اِدھر دیمیا نے لڑکی کی پوشاک باپ کو دکھائی۔ خرگوش کے تازے خون میں وہ تر تھی۔ مفتاح کو رونا آگیا لیکن اسے دل میں یقین تھا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

صحرا میں حلیمہ کے کپڑے محفوظ تھے۔ ایک رات میں اس کے بال اتنے بڑھ گئے کہ اس کے قدموں میں آ گئے۔ جب وہ غزالوں کے ساتھ دوڑتی اس کے بالوں کی لٹیں اڑ کر پُشت پر آجاتیں اور اس کا چہرہ صاف دکھائی دیتا۔

ان علاقوں میں کہیں ایک نوجوان بادشاہ رہتا تھا۔ اس کو ہرن کے شکار کا بہت شوق تھا۔ اپنی تیز گھوڑی پر سوار ہو کر اکثر وہ ان کی تلاش میں

صحرا کی طرف نکل جاتا۔ اور ایک دن جب اس نے غزالوں کی فوج کو دیکھا تو جو کچھ اس نے دیکھا اُسے یقین نہیں آیا۔

'ہیں! کیا یہ ایک لڑکی ہے جو غزالوں کے بیچ میں دوڑ رہی ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے؟ یا یہ کہ شاید میری آنکھیں مجھ کو دھوکا دے رہی ہیں؟ شاید یہ ایک مادہ ہرن ہے؟ لیکن آخر اس کا رنگ اتنا صاف کیوں ہے؟'

اس کا پُرانا اور معتبر غلام اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے سوالوں کے صحیح جواب ڈھونڈھے۔

غلام نے صلاح دی "دو پیالوں میں دلیا بھر کر رکھ دی جائے۔ ایک میں نمک چھڑک دیا جائے اور دوسرے کو پھیکا چھوڑ دیا جائے۔ دیکھیے کہ وہ کون سے پیالے کو پسند کرتی ہے"

بادشاہ اور غلام چھپ کر ایک طرف جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ حلیمہ نے دونوں پیالوں کو دیکھا۔ دونوں کو اس نے چکھا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ اس نے نمکین دلیا کھا لیا اور دوسرے پیالے کو ویسے ہی چھوڑ دیا۔

اب کیا تھا۔ نوجوان بادشاہ نے فوراً حکم جاری کیا کہ خواہ جیسے بھی ہو اس لڑکی کو اس کے پاس حاضر کیا جائے۔ وہ اسے محل کی رانی بنائے گا۔

حلیمہ دوڑنے میں کوئی جواب نہیں رکھتی تھی لیکن بادشاہ کے گھوڑے اس سے تیز تھے۔ جب اسے پکڑ لیا گیا تو حقیقتاً اسے دل میں خوشی ہوئی اس لیے اور کہ بادشاہ کے آدمیوں نے اسے بتایا کہ بادشاہ اسے اپنی دُلہن بنائے گا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادیانے بجے، نفیریاں بجیں۔ ہر ایک نے جشن منایا۔ متواتر آٹھ دن تک لوگ انواع و اقسام کے کھانے کھاتے رہے۔ بادشاہ نے دُلہن کو گہنوں سے، ہیرے جواہرات سے اور نفیس پوشاک سے سجا دیا۔

بادشاہ نئی ملکہ کو دل سے چاہتا تھا۔ جلد ہی اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا جو سبھی کا بہت چہیتا تھا۔ بس صرف ایک پریشانی تھی۔ جب وہ غزالوں کے ساتھ رہتی تھی تو حلیمہ کو بات چیت کرنے کا ڈھنگ بھول گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زبان پر کوئی موٹی تہہ بیٹھ گئی ہے اور اس کی وجہ سے الفاظ زبان پر نہیں آتے۔

بادشاہ نے اپنے حکیم کو بلایا۔ اس میں شک نہیں کہ ملکہ حسن میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ حکیم نے غور سے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ حلیمہ اپنے بچے سے کتنا پیار اور لاڈ کرتی ہے اور پھر تو اس نے اس طرح بچے کے ذریعہ حلیمہ کی قوتِ گویائی کی کمی کا علاج ڈھونڈھ نکالا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ حلیمہ اپنے دل کے ٹکڑے کو گود میں لیے پیار کر رہی ہے۔ بغیر کچھ کہے ہوئے اس نے بچے کو اس سے چھین لیا۔ دوڑ کر وہ کھڑکی کے پاس گیا اور اس نے بہانہ کیا کہ وہ بچے کو ابھی ابھی نیچے زمین پر پھینک دے گا۔

"ہائیں! ہائیں! یہ کیا کر رہے ہو۔ دیکھو میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ خدا کے لیے میرے لاڈلے کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔" یہ الفاظ صاف اور واضح طور سے ملکہ کی زبان پر آ گئے۔ اس کی زبان کا نقص جاتا رہا۔ اس وقت سے وہ ہماری تمھاری طرح صاف لفظوں میں بولنے اور باتیں کرنے لگی۔

اب ممکن ہے تم سوچو کہ مفتاح کی لڑکی کے دن پھر گئے اور اس کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھا۔ لیکن اس کی کہانی بڑی عجیب و غریب ہے اور ابھی اس کا دوسرا پہلو بھی ہے۔

جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ملکہ حلیمہ خوبصورت تھی۔ سب لوگ اس کی تعریف

کرتے ۔ بادشاہ کا وزیر جو نکما تھا وہ بڑا ہی نکما نکلا اور وہ حلیمہ پر جان و دل سے فریفتہ ہو گیا۔

اب وہ حلیمہ کے پیچھے پڑا رہتا۔ موقع پا کر اس نے اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔

ایک دن جب کہ بادشاہ باہر کہیں شکار کھیلنے گیا ہوا تھا اس نے ملکہ سے کہا "چلو کہیں بھاگ چلیں" جب اس نے جانے سے انکار کیا تو اس نے بچے کو غائب کر دیا اور محل کے باہر لے جا کر کہیں اور چھپا دیا۔

حلیمہ پریشان اور بچے کی تلاش میں بے چین تھی۔ لاکھ تلاش کرنے کے باوجود بچہ نہ ملا۔ اب تو ملکہ کو دہشت ہوئی اور وہ اس بات سے بہت ڈری کہ شکار سے جب اس کا شوہر واپس آئے گا تو وہ اسے کیا جواب دے گی۔

وہ چیخ چیخ کر رونے لگی "بادشاہ یہی کہے گا کہ میں نے لاپروائی کی۔ مجھے محل سے بھاگ جانا چاہیے اور جب تک کہ بچہ نہ مل جائے مجھے لوٹ کر نہیں آنا چاہیے۔

اس نے سر پر ایک پگڑی باندھی اور اپنے بالوں کو اس کے اندر چھپا لیا۔ اپنے ریشمی اور قیمتی کپڑے اس نے اتار دیے۔ بھیس بدل کر اس نے مردانے کپڑے پہن لیے۔ اس حلیہ میں جب وہ باہر نکلی تو کوئی اسے پہچان نہیں سکا۔ یہاں تک کہ وہ شہر سے بھی باہر اطمینان اور بہادری سے چلی گئی۔

وہ ایک گاؤں میں پہنچی۔ وہ در بدر ٹھوکریں کھاتی رہی۔ آخرکار ایک سرائے میں اسے کام مل گیا۔ اس نے سوچا "شاید یہاں ٹھہرنے کے لیے بہت سے لوگ آتے جاتے رہیں گے۔ اس طرح ممکن ہے مجھ کو بچے کی بھی کہیں سے

کوئی خبر مل جائے۔

اُدھر مفتاح بھی اپنی لڑکی کو نہیں بھولا۔ ایک سال تک تو اس نے ضبط کیا۔ اور غم کو دبائے رکھا۔ پھر ایک دن دیمبا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے باپ نے حلیمہ کا ذکر چھیڑا۔

"میرے بیٹے سچ سچ بتاؤ! کیا واقعی تم نے اپنی بہن کو جان سے مار دیا تھا؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ کسی طرح زندہ ہو؟

نوجوان نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا "والدِ محترم! میں اپنے چاقو کو حلیمہ کے گلے تک نہ لا سکا۔ اس کی پوشاک جو تر تھی وہ دراصل خرگوش کے خون میں ڈوبی تھی۔ میں نے اپنی بہن کو صحیح و سالم زندہ صحرا میں چھوڑ دیا تھا"

مفتاح کو اب اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل تھا "آؤ چلو۔ اسے دونوں مل کر ڈھونڈتے ہیں" اب اسے بے حد دُکھ تھا کہ اپنے لڑکے کو اس نے کتنا غلط حکم دیا تھا۔

اس طرح دونوں نکل پڑے۔ اور قسمت نے ایسا ساتھ دیا کہ چلتے چلتے اسی گاؤں کی سرائے میں پہنچے جہاں حلیمہ کام کرتی تھی۔ اتفاق کی بات یہ کہ مؤذن، بادشاہ اور بدمعاش وزیر سبھی اس رات کو ٹھہرنے کے لیے اسی گاؤں کی سرائے میں آئے۔

حلیمہ نے بڑھ کر سب کا استقبال کیا "آئیے آئیے! تشریف لائیے۔ سب کے لیے قیام کرنے کی جگہ ہے" ان کو دیکھتے ہی حلیمہ سب کو پہچان گئی لیکن اس نے چونکہ مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے اور سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی اس لیے ان میں سے کسی نے بھی اسے نہیں پہچانا۔

ان پانچوں آدمیوں سے اس نے کہا: "کھانا تیار ہونے میں تھوڑی دیر ہے اس لیے وقت گزارنے کے لیے میں آپ لوگوں کو ایک کہانی سُناتا ہوں۔"

اس بات سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے کہا: "ہم کہانی ضرور سُنیں گے۔"

حلیمہ نے کہانی شروع کرتے ہوئے کہا۔

"ایک زمانے کی بات ہے کہ کسی شہر میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ ایک دن اس کا باپ تجارت کے سلسلے میں ایک لمبے سفر پر گیا۔ اپنی لڑکی کو وہ ایک مؤذن کے سپرد کر گیا۔ مؤذن نے اُلٹی سیدھی یعنی جھوٹی خبریں اُڑانی شروع کر دیں۔ باپ نے ان جھوٹی خبروں پر یقین کر لیا اور حکم دے دیا کہ لڑکی کو قتل کر دیا جائے۔ اس نے کہا کہ اس لڑکی نے خاندان کا نام ڈبو دیا ہے اور اس کے بھائی کے ساتھ اسے لق و دق صحرا میں پھنکوا دیا۔

لیکن خدا رحم دل ہے۔ خدا کی شان نرالی ہے۔ صحرا میں اس نے غزالوں کی ایک فوج دی تاکہ وہ اس کی مدد کریں اور یہ دیکھیں کہ کہیں وہ تڑپ کر مر نہ جائے۔ خدا کی یہ بھی شان کہ اس نے ایک دن ایک بادشاہ کو شکار کھیلنے کے لیے ادھر ہی بھیج دیا۔ پھر بادشاہ نے اسے ڈھونڈھ نکالا اور اس کو اپنی ملکہ بنا لیا۔

بہرحال لڑکی کی قسمت اچھی نہیں تھی یا یہ کہ کسی کی بد دُعا لگ گئی تھی کہ بادشاہ کا وزیر ملکہ سے عشق کرنے لگا اور ایک دن اس نے ملکہ کے بچّے کو غائب کر دیا۔"

حلیمہ نے اپنی نگاہ سیدھی اس بدمعاش آدمی کی آنکھ میں گاڑ دی۔ ڈر کے

مارے وزیر کا بُرا حال تھا۔

"اب یہ عجیب اتفاق ہے کہ اِس کہانی کے سارے آدمیوں کو خدا نے اِس وقت اِس سرائے کے اندر بھیج دیا ہے۔" حلیمہ کی آواز میں سختی تھی۔

"یہ آدمی لڑکی کا شوہر یعنی بادشاہ ہے۔ یہ اُس کے باپ اور بھائی ہیں اور یہ سامنے جھُوٹا موّذن ہے۔ اُدھر وزیر ہے جس نے کہ اسے ٹھگنے کی کوشش کی۔

اور کہانی کے سُننے والو! آنکھیں کھول کر دیکھو۔ اور یہ لڑکا جو تمھارے سامنے کھڑا ہے اس کا نام حلیمہ ہے!!"

پھر لڑکے نے پگڑی اُتار کر پھینک دی۔ اس کے لمبے بال لہرانے لگے۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کے مانند چمک رہا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف تہلکہ مچ گیا۔

بادشاہ نے کہا: "تم میری چہیتی بیوی ہو اور خدا کا شُکر ہے کہ تم مجھے صحیح و سالم مِل گئیں۔"

مفتاح اور دیمبا نے کہا: "میری پیاری بچّی! میری ہر دلعزیز بہن!"

موّذن اور وزیر نے پھر جھُوٹ بولتے ہوئے کہا: "ہمارا مقصد نقصان پہنچانا نہیں تھا۔"

موّذن نے پھر تسلیم کیا کہ وہ جھُوٹ بولا تھا۔

وزیر نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا: "بچّہ محفوظ ہے۔"

دونوں بدمعاش اپنے اپنے کو بچانے کی فکر میں تھے۔

لیکن غصّے میں بھرے بادشاہ، مفتاح اور نوجوان دیمبا ان پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور جیل میں بند کر دیا گیا۔ پھر بادشاہ نے ان کو سزا دی

جس کے کہ وہ مستحق تھے۔

بادشاہ کے محل میں دوبارہ خوشی منائی گئی۔ حلیمہ اور اس کے بچے کی خوشی میں دعوتیں ہوئیں۔ اگر اس موقع پر تم ہوتے تو تم بھی مکھن، شہد اور دوسرے عمدہ قسم کے کھانے کھاتے بلکہ جو چاہتے اور ایک سے ایک اچھے کھانے کھا سکتے تھے۔

ان غزالوں کا کیا رہا؟ کیا ان کو بھی انعام ملا؟ ہاں ان کو بھی انعام ملا۔ بادشاہ نے یہ حکم جاری کرا دیا کہ ان علاقوں میں کوئی کسی غزالہ کا شکار نہ کھیلے اور سب لوگ اسے یاد رکھیں کہ یہ وہی غزالے ہیں جنھوں نے کہ ملکہ کی زندگی بچائی تھی۔

گپیں ہانکنے والا عُمر

ایک قبائلی خاندان بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ علی جو گھر کا چہیتا تھا سب اس کے منتظر تھے۔

گاؤں کے اسکول سے اسے بہت پہلے لوٹ آنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی ماں سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ جلدی آکر اس کی مدد کرے گا اور پہاڑ کے دامن میں جو چراگاہیں ہیں وہاں سے بھیڑوں کو واپس لائے گا۔

انتظار کرتے کرتے سب نے کھانا شروع کر دیا۔ روٹی کے لقموں کو موڑ کر شوربے میں ابھی وہ بھگو ہی رہے تھے کہ اتنے میں علی دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

”علی تمھارے کرتوت اچھے نہیں۔ تم نے گھر آنے میں دیر کیوں کی؟ جیسا کہ تم سے کہا گیا تھا تم نے اس پر عمل نہیں کیا۔ دیر سے آنے کی اگر کوئی معقول وجہ تم نے نہیں بتائی تو آج تمھاری خیریت نہیں؟ اس کو جھڑکتے ہوئے اس کی ماں نے ڈانٹا۔

”کیا کروں ماں! آنے میں دیر ہوگئی“ لڑکا سوچ رہا تھا کہ کیا بہانا کرے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنا وعدہ بھول گیا تھا اور اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل میں لگ گیا تھا۔

الجزائر کے جس حصّے میں قبائلی خاندان کے یہ لوگ رہتے تھے وہ کچھ دیہاتی اور جنگلی قسم کا تھا اور ہر مسئلہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا یا جھوٹ بولنا یہاں عام بات تھی۔ خرید و فروخت کے سلسلے میں یہ لوگ مکاری سے باز نہیں آتے تھے۔ سچ بات کہنا بہت مشکل تھا اور اپنے مخالف سے جھوٹ بولنا ان کی سرشت میں داخل تھا۔ ابھی ابھی علی کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی ماں کو اس پر بہت غصّہ ہے۔ لہٰذا اس کے وار سے بچنے کے لیے وہ جھوٹ بولنے پر مجبور تھا۔

"ہاں ماں، واقعی مجھ کو آنے میں دیر ہوگئی" علی نے بات بناتے ہوئے کہا۔ اسکول کے بعد واقعی میں گھر آ رہا تھا کہ راستے میں ایک اجنبی سے میری ملاقات ہوگئی۔ وہ بھاری بھرکم اور خوفناک آدمی تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور اپنے اُونٹ پر بٹھا کر سیدھا پہاڑ کی طرف چلتا بنا۔ وہ تو اتّفاق ہی ہوا کہ ٹھوکر لگی اور اُونٹ ایک جگہ گر گیا۔ اس طرح اس کی پیٹھ کی ہڈی ڈھیل ہوگئی اور دو تھیلے نیچے گر گئے۔ اور جب کہ اجنبی ان کو اُٹھا کر پیٹھ پر دوبارہ رکھ رہا تھا مجھ کو موقع مل گیا اور میں سیدھا گھر بھاگا۔"

باتیں بناتے دیکھ کر سب ہی کو ہنسی آگئی "اُونٹ کو کہیں ٹھوکر لگتی ہے اور وہ گھٹنوں کے بل گرتا ہے" اس کی ماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور وہ ہاتھ اُٹھا کر مارنے کے لیے اس کی طرف لپکی۔

"دیکھو بیٹے! جب اُونٹ پر سامان لدا ہوتا ہے تو تھیلے نیچے گرنے کا سوال ہی نہیں" باپ نے کہا اور وہ ایک ہاتھ میں ایک چھڑی لے کر اس کی طرف لپکا۔ محض لڑکے کی دادی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموش رہیں۔

"لڑکا جھوٹ بولنے میں کمال رکھتا ہے" وہ ہنسیں "یہ جھوٹ اتنا ہی

اچھا ہے جتنا کہ عُمر نے ایک بار جھوٹ کہا تھا اور بتایا تھا کہ گھر کی چھت خالص چاندی کی بنی ہے۔"

گھر چاندی کی چھت کا! یہ تو واقعی بڑی عجیب بات تھی۔ علی کے باپ کو رحم آگیا اور اس نے اس کا بازو پکڑ کر چھوڑ دیا۔ پھر چھڑی بھی اس نے گرا دی۔ علی کی ماں کو بھی حیرت تھی اور وہ اپنی ساس کے چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔ ان سبھی کو کہانیاں سُننے کا شوق تھا اور الجزائر میں اطلس پہاڑ کی ڈھلان پر جو قبیلے رہتے تھے وہ سبھی کان لگا کر کہانیاں سُنتے تھے۔

سب کی توجہ علی سے ہٹ گئی۔ وہ بھی سب کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ گیا اور روٹی کے ٹکڑے شوربے میں ڈبونے لگا۔ اب سب کی خفگی دُور ہو چکی تھی۔ سب لوگ دادی امّاں کو دیکھ رہے تھے جنھوں نے سفید جھوٹ کے متعلق پُرانی کہانی سُنانی شروع کر دی تھی۔

"پُرانے زمانے میں ایک آدمی تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ دونوں بڑے لڑکے نیک تھے۔ چھوٹا بھی حقیقتاً بُرا نہیں تھا۔ بس اس کی صفت یہ تھی کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے ذرا چنچل تھا۔

ایک دن بڑے لڑکے نے باپ سے کہا: "میرے لیے ایک خچّر خرید دیجیے۔ کچھ روپیوں کا بندوبست کر دیجیے۔ میں باہر جاؤں گا اور اپنا کاروبار کروں گا۔"

"بہت خوب!" اس کے باپ نے کہا۔

لڑکا واقعی بڑا ہو چُکا تھا اور باہر جا کر دو چار پیسے کما سکتا تھا لیکن اصلیت کا کسی کو کچھ پتہ نہیں؟ ہو سکتا ہے قسمت والا ہو اور دولت پر ہاتھ مار بیٹھے۔ اس لیے باپ نے چھانٹ کر ایک خچّر دے دیا اور ایک تھیلی جس میں چاندی کے سِکّے رکھے ہوئے تھے۔

لیکن تین دن کے بعد لڑکا گھر واپس آگیا۔ نہ ہاتھ میں خچر اور نہ ہاتھ میں چاندی کے سکّوں کی تھیلی۔

" ایک دن راستہ طے کرکے میں جو آگے بڑھا " اس نے اپنے باپ سے کہا " تو میں ایک جنگل میں پہنچا۔ دیکھا تو سامنے جنگل کے بیچ میں ایک وسیع چراگاہ ہے جہاں تنومند اور فربہ بھیڑیں چر رہی ہیں۔ چراگاہ کے بیچ میں ایک مکان ہے جس کی چھت چاندی کی بنی ہوئی ہے ۔ مجھے دیکھتے ہی مکان کا مالک باہر آگیا اور اس نے میرا خیر مقدم کیا "

" خدا تم کو حفظ و امان میں رکھے " اس آدمی نے کہا " آخر تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

میں نے جواب دیا " وعلیکم السّلام بڑے میاں ۔ میں قسمت آزمانے باہر نکلا ہوں "

" تو تم ٹھیک جگہ پہنچے ہو " اس نے کہا " سامنے میری بھیڑوں کو تم دیکھ رہے ہو ؟ گھر بھی تم میرا دیکھو۔ کتنا شاندار ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی چھتیں چاندی کی بنی ہوئی ہیں ـــــ اچھا چلو، اسی بات پر ہماری تمھاری شرط ہو جائے ! اگر تم مجھ سے بڑا جھوٹ بولو گے تو میں ہار جاؤں گا اور ساری دولت تمھاری ہو جائے گی۔ لیکن اگر تم شرط ہار گئے تو تمھارا خچر اور سکّوں کا تھیلا میرا ہو جائے گا "

" میں نے سوچا۔ موقع اچھا ہے۔ جھوٹ بولنا اور گپ ہانکنا مشکل نہیں اور اگر ایک بار جو شرط میں جیتا تو پھر چاندی والی چھت کا گھر میرا ہو جائے گا۔ بھیڑیں بھی سب میری ہو جائیں گی۔ لہٰذا میں راضی ہو گیا " لڑکے نے باپ سے کہا۔

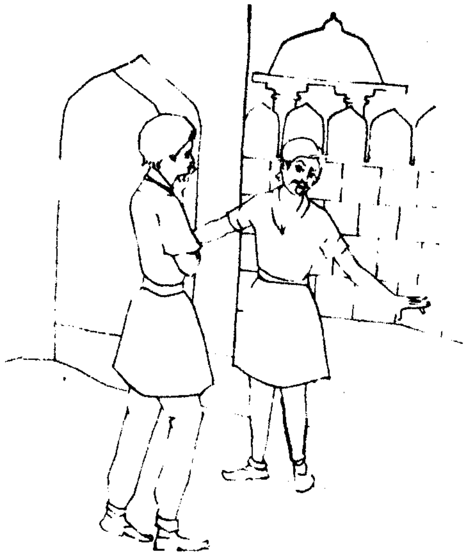

"پھر اس آدمی نے ایک جھوٹی بات گڑھ کر سُنائی۔ سچ کا اس میں کوئی شائبہ نہیں تھا۔ اس کے بعد میری باری آئی۔ میں نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن جھوٹ بولنے اور گپ ہانکنے میں میں اس کو مات نہیں دے سکا بلکہ اُلٹا شرط ہار گیا۔ ظاہر ہے پھر اس آدمی نے خچر اور روپے دونوں مجھ سے لے لیے۔ اس طرح قسمت اچھی ہونے کے بجائے خراب ہوگئی اور میں فقیر ہوگیا۔" یہ کہہ کر جوان بلبلا اُٹھا۔

کچھ دنوں کے بعد دوسرے لڑکے نے باپ سے کہا "میرے لیے بھی ایک خچر اور کچھ روپیوں کا انتظام کر دیجیے۔ میں بھی قسمت آزمانے کے لیے باہر جانے کو تیار ہوں۔"

"جو ایک بھائی پر بیتی ہے وہی سب پر بیتے گی۔" باپ تینوں لڑکوں کو

بہت پیار کرتا تھا اور ان کو لختِ جگر سے کم نہیں سمجھتا تھا۔

بہرحال دوسرا لڑکا بھی ٹھگا گیا۔ تین دن کے بعد وہ بھی لوٹ آیا۔ ننگے پیر اور بغیر روپے پیسے کے۔ اسے بھی چاندی کی چھت والا مکان ملا تھا۔ مالک مکان سے جھوٹ بولنے میں وہ کچھ بہتر ثابت ہوا لیکن آخر میں شرط وہ بھی ہار گیا۔

"میں نے گڑھ کر سفید جھوٹ بولا" دوسرے لڑکے نے رپورٹ دی مثلاً میں نے کہا کہ ایک بار مسلسل سات دن تک سورج نہیں نکلا۔ "دنیا میں اتنا اندھیرا چھا گیا کہ بھیڑیں پہاڑیوں پر سفید سفید جھاڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔

مکان کا مالک اپنے آپ کو ضبط نہ کر سکا۔ اسے ہنسی آ گئی۔ بھلا یہ بھی جھوٹ ہے۔ کالے بادل سے بھلا کہیں دن میں رات ہو سکتی ہے خواہ بھلے ہی سورج سات دن تک نہ نکلے۔ ظاہر ہے جب میں شرط ہار گیا تو اس نے میرا خچر اور سارے روپے لے لیے" دوسرے لڑکے کا برا حال تھا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔

اب چھوٹے لڑکے کی باری تھی۔ اس کا نام عمر تھا۔ وہ بھی ایک خچر اور روپیوں کی تھیلی لے کر روانہ ہوا۔

"اپنے بھائیوں کی طرح میں بھی روزی کماؤں گا" اس نے اپنے باپ سے کہا "چاندی کی چھت والا گھر بھی جیتوں گا اور تنومند بھیڑیں بھی میری ہی ہو کر رہیں گی"

دونوں کے ساتھ جو قصہ پیش آیا تھا وہی اس کے ساتھ بھی آیا۔ باپ نے دیکھا کہ سب سے چھوٹا لڑکا بھی ضد کر رہا ہے تو اسے افسوس ہوا لیکن بہرحال اس کا رویّہ تینوں کے ساتھ جیسا تھا۔

عُمر اپنے خچّر پر سوار ہو کر چلتا رہا۔ جنگل کے بیچ میں اسے بھی چراگاہ، بھیڑیں اور چاندی والا گھر مِلا۔ خچّر خوش ہو کر ہنہنانے لگا۔ پھر اس آدمی نے گھر سے نِکل کر اس کا استقبال کیا۔

"السلام وعلیکم! اے نوجوان، یہاں کس لیے آئے ہو؟" اپنے بھائیوں کی طرح عُمر نے جواب میں کہا "وعلیکم السلام چچا! میں اپنی قسمت آزمانے باہر نکلا ہوں" پھر اس کے سامنے بھی وہی پیش کش تھی۔

"ہماری تمھاری شرط ہو جائے۔ جو بڑا جھوٹ بولے گا وہ خود بخود ایک دوسرے کے مال پر قابض ہو جائے گا" یہ کہہ کر آدمی زور سے ہنسا۔ تجویز معقول تھی۔ دو خچّر پہلے ہی وہ جیت چُکا تھا اور روپوں کے دو تھیلے بھی۔ تیسری بار شرط جیتنے میں بھی اسے کوئی شک نہیں تھا۔

لیکن عُمر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ اپنے بڑے بھائیوں کے قصّے سُن سُن کر لڑکا نئی نئی کہانیاں سوچنے کی فکر میں تھا۔

"میرے بُزرگ! قبل اس کے کہ ہم جھوٹ بولنے میں اور گپ ہانکنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں" عُمر نے کہا "پہلے ہم سچّا واقعہ بیان کریں اور آپ اجازت دیں تو سب سے پہلے میں ہی شروع کرتا ہوں"

"ایک دفعہ جب کہ میں اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا تو میں یتیم تھا" یہ سُن کر آدمی اسے گھورنے لگا۔ بھلا یہ بات بھی سچ ہو سکتی ہے۔

"میرے پاس ایک مُرغ تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مُرغ کی پیٹھ پر کھاد نِکل آئی ہے۔ یہ کھاد بڑھنے لگی۔ اسے ڈھکنے کے لیے مٹّی اُٹھا کر میں نے ڈال دی۔ اس مٹّی پر گھاس اُگ آئی۔ پھر اس گھاس میں سے انگور کی بیلیں نکلیں۔ ان بیلوں میں تربوز پھلے۔ میں نے بڑھ کر ایک پکّا ہوا تربوز توڑ لیا۔ اسی وقت

چاقو سے میں نے اسے کاٹا اور عجیب اتفاق کہ چاقو غائب ہوگیا۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے میں نے اپنا ہاتھ تربوز کے اندر ڈال دیا۔ اس میں کوئی چیز چھپی تھی جو میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف کھینچنے لگی اور میں اسی میں گم ہوگیا۔ جو آنکھ کھلی تو دیکھا سامنے لق و دق میدان ہے اور اس میدان میں فوج لیفٹ رائٹ کر رہی ہے۔ میں نے جنرل سے کہا: "حضور! میرا تیز چاقو گم ہوگیا ہے برائے مہربانی اسے ڈھونڈھوا دیجیے۔"

جنرل نے جواب دیا: "یہاں ٹھہرنے کا وقت نہیں۔ بادشاہ کا لڑکا کھو گیا ہے۔ ہم اسے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ بہرحال تم چاہو تو ہمارے ساتھ ہو جاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ ایک بھاری پھلی درخت سے لٹک رہی ہے۔ اسے توڑ کر جب میں نے اُبالنے کی کوشش کی تو اُبلنے کے بعد یہ سَو گُنا بڑی ہوگئی۔ اس کی وجہ سے پانی باہر نکل آیا۔ پھلی بھی باہر آگئی۔ پھر دریا کا ایک سوتا بہہ نکلا اور اس کے ساتھ پھلی بہہ کر میرے باغ میں آگئی۔ باغ میں یہ خود بخود مٹی میں دھنس گئی اور پھر اس جگہ سے ایک پودا پھوٹ نکلا جو بڑا ہو کر دیو نُما درخت بن گیا۔

اس درخت کی شاخوں پر دو طرح کی پھلیاں نکلیں۔ اوپر یہ کالی کالی تھیں اور نیچے سفید۔ میں نے درخت کو ہلکے سے ہلانے کی کوشش کی تو ساری پھلیاں نیچے گر گئیں۔ فرش پر جگہ کم تھی۔ لہٰذا میں نے پھلیوں کو چراگاہ میں پھیلا دیا پھر میں نے بیلوں کو کچلنے کے لیے کہا لیکن بیل قابو سے باہر ہو گئے اور رسّا توڑ کر بھاگ نکلے۔

بیلوں کو پٹانے کے لیے میں نے انھیں پکی ہوئی انجیریں دیں۔ جب وہ کھا کھا کر چبانے لگے تو میں نے واپس لاکر درخت سے باندھ دیا تاکہ پھلیوں کو کچل کر ان کے دانے نکال دیں مگر باوجود بہلانے پھسلانے کے کسی طرح وہ قابو میں نہیں آتے تھے۔

ہار کر میں نے اُونٹ پکڑے لیکن ان سے بھی پھلیوں کے دانے الگ نہیں ہوئے۔ اسی

وقت مجھے ایک ننھی سی لال چیونٹی ملی۔ اس کے ذریعہ میرا کام بن گیا۔ پھلیوں کے دانے الگ ہو گئے۔ انھیں لے جا کر میں نے بازار میں دو ہزار چاندی کے سکّوں میں بیچ دیا۔"

"تو دیکھا جناب آپ نے" یہ لڑکا تیزی سے اب بھی گپ ہانک رہا تھا اور مکان مالک کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

"میں نے یہ سچی کہانی تمھیں سُنائی۔ اگر اجازت دیں تو میں کچھ جھوٹی کہانیاں بھی سُناؤں۔"

آدمی سے رہا نہ گیا۔ وہ ہنس پڑا۔ کھلکھلا کر ہنسا اور قہقہہ لگاتے ہوئے چیخ کر اس نے کہا۔

"اگر یہ ساری گپ تمھاری سچ ہے تو تمھارا جھوٹ پھر کیسا ہوگا؟ میں نے ہار مان لی۔ تم جیت گئے۔ میں اس سے بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ آج سے چاندی کی چھت والا گھر تمھارا ہو گیا۔ تنومند بھیڑیں بھی تمھاری۔ میری دولت، تمھارے بھائیوں کی دولت اور ان کے علاوہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ سب تمھارا ہے۔ اس لیے کہ صاحبزادے آج سے ثابت ہو گیا کہ تم سے بڑی گپ ہانکنے والا اور دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بولنے والا اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔"

جب کہانی ختم ہوگئی تو علی فرش سے اُٹھا۔ اپنی دادی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ جھولنے لگا۔ پھر وہ چمٹ گیا اور اپنی دادی اماں کا اس نے شکریہ ادا کیا۔ ان کی وجہ سے وہ پٹنے سے بچ گیا تھا۔ دو دن تک متواتر گھر میں کہانی کے چرچے رہے اور عُمر کا نام سب کی زبان پر بار بار آتا رہا۔

جادُو کی بانسری

زمانۂ قدیم میں بھی افریقہ کے گڈریے اپنی بھیڑوں کی حفاظت اسی طرح کرتے تھے جیسے کہ آج کل کے چرواہے دُنیا کے کسی مُلک میں کرتے ہیں۔ چراگاہ میں جانے سے پہلے ہر چرواہا دو چیزیں ضرور لے لیتا تھا۔ ایک تو ڈنڈا جس میں ایک ہُک یعنی کانٹا لگا رہتا تھا اور اس کو وہ بھاگنے والی بھیڑ کی ٹانگ سے پھنسا دیتا تھا۔ دوسری چیز ایک بانسری تھی جسے بجاکر وہ اپنا وقت گزارتا تھا۔

بھیڑ چرانا آسان تھا اور بس یہی ایک کام تھا کہ ان کی رکھوالی اچھی طرح کی جائے لیکن اچھی طرح رکھوالی کرنے کے باوجود دن کُھل جاتا تھا اور وقت کاٹنا مشکل تھا۔ بہرحال بانسری کا بجانا ایک اچھا مشغلہ تھا اور اسی بہانے وقت آسانی سے کٹ جاتا تھا۔ اس کے بجانے میں کوئی محنت تو پڑتی نہیں تھی۔ مُنھ میں اس کی نلکی لگاکر پھُونکیے اور اس کے سوراخوں پر اُنگلی دوڑاتے رہیے اور نگاہ بھیڑوں پر رکھیے۔ اس طرح ایک پنتھ دو کاج ہو جاتا ہے۔

الجیریا میں جہاں قبائلی عرب رہتے ہیں، بھیڑیں پالنا عام پیشہ ہے۔ عام چرواہوں میں بدّو نام کا ایک چرواہا تھا۔ بانسری بجانے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا تھا بلکہ لوگ کہتے تھے کہ اس کی بانسری میں جادُو ہے۔

احمد کے پاس بہت ساری بھیڑیں تھیں اور وہ اس معاملے میں امیر تھا۔ بدّو اس کے یہاں کام کرتا تھا ــــ روزانہ صبح وہ اپنے آقا کے گلّوں کو گاؤں سے دُور چراگاہ میں لے جاتا تھا۔ پہاڑیوں پر پہنچ کر بدّو کو خیال رکھنا پڑتا تھا کہ کہیں اس کی کوئی بھیڑ بہک کر چٹانوں کے درمیان کسی کھوہ میں نہ چلی جائے۔ اگر ایک بار وہ نظر سے اوجھل ہوئی تو بس گئی۔ اس کے لیے کھوہ میں جاکر ڈھونڈھنا آسان نہیں تھا۔

ان کھوہوں میں ایک جن رہتا تھا۔ بدّو کے گاؤں میں ہر ایک ــــ کا یہ اعتقاد تھا کہ پہاڑیوں کے اندر بھوت پریت، جن اور چڑیلیں رہتی ہیں۔ اور اگر کوئی بھیڑ وہاں گئی یا کوئی چرواہا بھول کر بھی وہاں پہنچ گیا تو اس کی خیریت نہیں۔ لوٹ کر آنا ناممکن ہے۔

بدّو کو جن کے بارے میں تجسّس تھا۔ کبھی کبھی وہ ہمّت کرکے غار کے مُنھ پر پہنچ جاتا اور نیچے جھانک کر دیکھتا کہ اندر کیا ہے۔ عجیب اتّفاق کہ ایک دن ایک کھوہ کے مُنہ پر ایک بانسری پڑی ہوئی اسے دکھائی دی۔ کیا کوئی جن اسے وہاں غلطی سے گرا گیا تھا یا اس کے لیے کوئی اور اسے وہاں ڈال گیا تھا۔ اس کی اپنی بانسری کھو گئی تھی۔ ممکن ہے کہ اُس کے بدلے میں یہ اس کو مل رہی ہو۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے لیکن اُس کو بانسری کی سخت ضرورت تھی لہٰذا اس نے اُٹھالی۔ گھر لوٹتے لوٹتے اس نے اسے سنبھال کر رکھ لیا۔

دوسرے دن بدّو نے اسے آزمایا۔ کیا خوب بانسری تھی۔ الجیریا کی ان پہاڑیوں پر اس سے پہلے اتنی سُریلی آواز کبھی نہیں سُنی گئی تھی۔ جن کی بانسری

نے تو کمال ہی کر دیا۔ بانسری کی آواز سن کر بھیڑیں گھاس چرنا بند کر دیتیں۔ وہ جھومنے لگتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ سب مسحور ہو گئی ہیں۔ گھاس کی طرف وہ دیکھتی بھی نہیں اور ان پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ ناچ ناچ کر مست ہو جاتیں۔

"بدو! کیا بات ہے کہ ہماری بھیڑیں ان دنوں دُبلی ہو رہی ہیں؟ کیا وہ کچھ کھاتی نہیں؟"

اس کے آقا احمد نے ایک دن پوچھا۔ بدو خاموش رہا اور کچھ مسکرایا۔ وہ چاہتا نہیں تھا کہ نئی بانسری کے بارے میں کسی کو بھی کچھ بتائے۔ سوچ کر اس نے کہا:
میں نے خیال نہیں کیا آقا کہ وہ دُبلی ہو رہی ہیں۔

اس کی یہ ہمت تو پڑی نہیں کہ بتائے کہ اس کی سُریلی آواز سے بھیڑیں مسحور ہو جاتی ہیں اور کھانا پینا بھول جاتی ہیں۔

"پہاڑیوں پر گھاس کافی ہے یا نہیں؟"

"ہاں! آقا — گھاس تو بہت ہے —"

"پھر یہ تعجب ہے کہ میری بھیڑیں موٹی نہیں ہو رہی ہیں" اس طرح بھیڑوں کے مالک احمد اور اس گڈریے لڑکے بدو کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔

احمد کو اطمینان نہیں ہوا۔ اس نے طے کیا کہ وہ خود جا کر معلوم کرے گا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

ایک دن صبح سویرے وہ چراگاہوں کی طرف چل پڑا۔ بدو کے آنے سے پہلے وہ ایک طرف جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

بدو بھی جلد ہی وہاں آگیا۔ بھیڑیں اس سے آگے آگے۔ چراگاہ میں پہنچتے ہی وہ نرم نرم گھاس پر ٹوٹ پڑیں۔ انھوں نے تیزی سے چرنا شروع کر دیا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بھوکی ہیں۔

کچھ دیر کے بعد بدّو نے اپنی بانسری نکالی۔ جلد ہی اس کی سُریلی آواز پہاڑیوں میں گُونجنے لگی ـــــ احمد جو پہاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا اس کو اپنی نظروں پر دھوکا ہوا کہ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ منٹوں میں بھیڑوں نے گھاس سے مُنھ ہٹا لیا۔ آواز کے ساتھ ساتھ وہ اپنا سر ہِلاتی اور ناچتی رہیں جب تک بدّو نے بانسری بجانا بند نہیں کر دیا۔

بدّو کو بھی مزا آتا تھا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ بانسری بجاتا رہے۔ گویا کہ خود اس پر اور ساری بھیڑوں پر کسی پَری نے جادُو کر دیا ہے۔

" اوہ! یہ بات ہے کہ بھیڑیں میری کیوں، موٹی نہیں ہو رہی ہیں۔ جب وہ کچھ کھاتیں ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ دُبلی ہوں گی ـــــ" احمد اس طرح سوچ رہا تھا لیکن چند لمحے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ خود اس کا جسم ہِل رہا ہے۔ پَیر بھی اُچھلنے لگے۔ ہاتھ اوپر نیچے ہونے لگے۔ وہ ابھی ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ خود بھی پُوری طرح ناچنے لگا۔ اس جھاڑی میں کانٹے تھے۔ جیسے جیسے وہ اپنی رَو میں اِدھر اُدھر کُودا تو نوکیلے کانٹے اس کے پیروں میں خوب چُبھے یہاں تک کہ جب وہ گھر پہنچا تو لہولہان تھا۔

" آخر تم کو یہ سب کیا ہو گیا ہے ـــــ؟" احمد کی بیویوں نے اس سے پُوچھا۔

" وہ جو لڑکا بدّو ہے نا۔ اس کے پاس ایک بانسری ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ سب ہوا۔" اس نے عورتوں کو جواب دیا۔ " اس کی بانسری کی آواز سن کر جھاڑی میں چھُپا تھا مجھے ناچنا پڑا اور وہاں کانٹے بہت تھے۔ کیا کروں مجھے ہوش نہیں رہا اور بے خیالی میں کانٹے اِدھر اُدھر چُبھ گئے۔"

" تو گویا کہ تم کانٹے دار جھاڑیوں میں ناچے تھے ـــــ؟" اس کی بیویوں کو

یقین نہیں آیا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔

"نہ پوچھو کہ میں کیسے ناچا۔ کیا کروں میں مجبور تھا۔ بدّو کی بانسری کی آواز سُنتے ہی مجھے ناچنا پڑا۔"

"احمد تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ دماغ تو حاضر ہے؟ یا یہ کہ تم کو بھی باتیں بنانی آگئیں ——؟" اس کی بڑی بیوی نے دوسری بیویوں کی طرف دیکھا کہ آخر ان سب کا کیا خیال ہے۔

"تم کو یقین نہیں آتا۔ اچھا تو چلو میں دکھا دوں گا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ بدّو کو یہاں بُلاؤ۔ اس سے کہو کہ اپنی بانسری بھی لیتا آئے۔ یہ دروازہ ہے اس سے جکڑ کر مجھ کو تم لوگ باندھ دینا۔ تم لوگ پھر خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ میں ناچنے سے باز نہ رہ سکوں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگ بھی ناچنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔"

ان کو یقین نہیں آیا۔ ظاہر ہے یقین کرنے کی بات بھی نہیں تھی۔ بھلا ایسی مہمل بات پر کون یقین کرتا لیکن انھوں نے احمد کی بات مان لی۔ بدّو اپنی بانسری لے کر آگیا۔ احمد کو دروازے سے باندھ دیا گیا۔

"چلو! شروع کرو —— بدّو اپنی بانسری بجاؤ ——" احمد نے چیخ کر بآوازِ بلند کہا۔ چرواہا کچھ ڈرا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سہم سا گیا لیکن احمد بہرحال اس کا آقا تھا اس لیے وہ حکم ماننے پر مجبور تھا۔ آخرکار اس نے بانسری کو ہونٹوں سے لگایا۔

جیسے ہی سُریلی آواز نکلی احمد میں جُنبش آگئی۔ باوجود اس کے کہ وہ بندھا ہوا تھا اس کے پیر اُوپر نیچے ہونے لگے۔ اس کے ہاتھ بھی ہلنے لگے۔ سر اس کا دروازے سے ٹکرانے لگا اور وہ برابر ناچتا رہا۔

اس کی بیویوں نے دیکھا نہیں کہ احمد پر کیا کیفیت طاری ہے اس لیے کہ وہ خود ناچ رہی تھیں۔ ان کے فراک یا اسکرٹ چھتری کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ان پر مستی کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ مستقل ناچتی رہیں یہاں تک کہ ناچتے ناچتے وہ گر پڑیں۔

وہ تھک کر چُور ہو گئی تھیں۔ ان کو یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ ان کے شوہر کا ہلتا ہوا سر کب ایک نوکیلی کیل سے ٹکرا گیا اور کیل اس کے سر میں چُبھ گئی۔ یہ بھی وہ نہیں دیکھ سکیں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کی لاش دیوار سے لٹک رہی تھی۔

اُسی وقت اتّفاق سے احمد کا لڑکا گھر آ گیا۔ وہ یہ سب دیکھ کر چیخ پڑا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا: "بڈو! بند کرو — یہ کیا ہو رہا ہے — دیکھتے نہیں ہو

تم نے کیا کر ڈالا ہے ـــــ؟ اپنی منحوس بانسری کو بند کرو ـــــ"

اس نوجوان کو بھی پریشانی تھی اور اس کے پیر اُوپر اُٹھنے لگے تھے۔ وہ بانسری کے جادُو سے بال بال بچا۔

" تم نے اپنے آقا کو ختم کر دیا ـــــ" احمد کے لڑکے نے بدو پر الزام لگایا۔ " اب تم کو بھاری سزا بھگتنی پڑے گی "

" بھلا میرا اس میں کیا قصور ہے۔ میں تو محض اپنی بانسری بجاتا رہا ـــــ آقا نے مجھ کو خود حکم دیا تھا کہ بجاؤ ـــــ میں جُرمانہ کیوں دوں گا ـــــ"

چرواہے نے جواب دیا۔

" اچھا تم نہیں مانتے ہو تو چلو قاضی کے پاس چلیں۔ وہاں جو فیصلہ ہوگا اس کو تو مانو گے ـــــ"

افریقہ کے دوسرے گاؤں کی طرح اس قبائلی گاؤں میں بھی یہ رواج تھا کہ اپنا جھگڑا لے کر قصبے میں لوگ قاضی کے پاس جاتے۔

راستے میں ان کو ایک آدمی مِلا۔ یہ آدمی دو بیل لے کر بازار جا رہا تھا۔

" السلام وعلیکم !" بیل لے جانے والے آدمی نے دونوں عام مسافروں کو آواز دے کر کہا ـــــ " یہ مُنہ لٹکائے ہوئے دونوں کہاں چلے جا رہے ہو ـــــ؟"

" وعلیکم السلام !" احمد کے لڑکے نے جواب دیا ـــــ " ہم قاضی کے پاس جا رہے ہیں۔ وہ فیصلہ کرے گا کہ یہ چرواہا میرے باپ کو مار کر جُرمانہ دے گا کہ نہیں ـــــ اس کے پاس ایک منحوس بانسری ہے ـــــ اسے بجا کر نوبت اس نے یہاں تک پہنچا دی کہ اس کا آقا ناچتے ناچتے مر گیا "

" ہو ! ہو ! ـــــ ہا ! ہا ! ـــــ" بیل والا آدمی بڑے زور سے ہنسا۔

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ـــــ؟" "گانا سُن کر بھلا کوئی آدمی ناچے گا؟ یہ تو اس کی مرضی ہے ناچے یا نہ ناچے ـــــ"

"ایسا ہی ہے تو دیکھ لو ـــــ چرواہے! چلو بانسری بجاؤ۔ میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں کہ میں ناچوں گا کہ نہیں ـــــ"

لیکن بانسری کی تاثیر ہی اور تھی۔ وہ ناچنے لگا اور احمد کا لڑکا بھی اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔ محض بدّو اپنے پیروں پر ٹھیک سے کھڑا تھا ـــــ اس جادُو کا یہی تو کمال تھا۔ جن نے جادُو میں کچھ ایسی تاثیر رکھی تھی کہ بانسری بجانے والا نہیں ناچے گا۔

ہاں تو پھر کیا ہوا ـــــ بیل والا آدمی اور احمد کا لڑکا دونوں ناچتے رہے اور بیل بھی ناچنے لگے ـــــ ناچتے ناچتے بیل ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور وہاں سے وہ پھر نیچے کچھ اس طرح گرا کہ اس کی گردن مُڑ گئی۔

چرواہے نے گھبرا کر جلدی سے بانسری بند کر دی۔ بانسری کا جادُو دیکھ کر وہ بھی دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے پہلے ہی کیا کم پریشانی تھی۔ اب تو بیل والا بھی اس کے پیچھے پڑ گیا اور کہنے لگا کہ مرے ہوئے جانوروں کا ہرجانہ اسے دینا پڑے گا۔ احمد کے لڑکے کے ساتھ جاکر قاضی سے شکایت کرے گا۔

قاضی کو جب پُورا قصّہ معلوم ہوا تو وہ بھی زور سے ہنسا۔ اس کا قہقہہ بیل والے آدمی سے تیز تھا۔

"یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے ــ؟" اس نے کہا ـــــ "بانسری کی آواز پر بھلا کون ناچے گا نہ یہ کہ کوئی آدمی یا جانور ناچتے ناچتے مر جائے گا۔"

"قاضی صاحب! گستاخی معاف ہو۔ یہ بانسری جادو کی ہے۔" بدو نے بانسری دکھاتے ہوئے کہا۔ "پہاڑیوں میں جن کی ایک کھوہ سے میں اسے اُٹھا کر لایا ہوں۔ اس کا جادو سبھی کو مسحور کر دیتا ہے بجز اس کے جو اسے بجاتا ہے ــــ"

جب تک کہ میں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ لوں گا یقین نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی ہے تو چلو بجا کر اس کی تاثیر دکھاؤ ــــ" قاضی بھی دوسرے آدمیوں سے مختلف نہیں تھے۔

قاضی صاحب کے صحن میں کھڑے ہو کر بدو نے جن کی بانسری ایک بار پھر اپنے ہونٹوں سے لگائی۔ اس کی انگلیاں حرکت میں آگئیں۔ سُریلی آواز تے ہی قاضی صاحب کے گھر کے سبھی لوگ مرد، عورتیں، ملازم بھاگتے ہوئے ھر سے باہر آگئے۔

بیل والا آدمی بھی ایک بار پھر ناچنے لگا۔ احمد کا لڑکا بھی اُچھلنے کودنے لگا۔ سب لوگ حیران تھے کہ قاضی صاحب بھی بڑی تیزی سے ناچنے لگے۔ ہر ایک پر رقص و سرور کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہاں تک کہ ملازم بھی اپنے آپ کو نہیں روک سکے۔ ناچنے میں وہ اس قدر مصروف ہوتے کہ ان کے بھی ہوش و حواس گم ہو گئے اور سب کے سب ناچتے ناچتے گر کر مر گئے۔ کوئی بھی زندہ نہیں بچا ــــ نہ قاضی، نہ احمد کا لڑکا، نہ بیل والا اور نہ قاضی کے گھر کا کوئی آدمی ــــ سب ختم اور فنا فی الموت ہو گئے۔

بدو چرواہا تنہا بچ گیا ــــ اس نے سوچا کہ قاضی کے گھر اور اس کے خزانوں پر قبضہ کر لیا جائے؟ اس کے آقا کی بھیڑیں بھی اب اسی کی ہیں ــــ اب کون تھا جو اُسے روکتا ــــ اس طرح بدو کو مُفت میں بہت سا مال مل گیا

اور وہ ایک امیر آدمی بن گیا۔

جن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دوسرے دن بدو بھاگ کر پہاڑی کے کنارے کھوہ میں پہنچا تاکہ وہ جادُو کی بانسری واپس کر دے۔

سنبھال کر اس نے ایک چٹان کے کنارے جہاں اس نے پہلے یہ پائی تھی بانسری کو رکھ دیا۔ جن کو خوش کرنے کے لیے وہیں اس نے ایک بھیڑ کو باندھ کر چھوڑ دیا۔

جن کی بانسری کا پتہ نہیں چلا کہ پھر کیا ہوا اور ظاہر ہے پتہ بھی کیسے لگتا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ غائب ہو گئی ورنہ مصر اور شمالی افریقہ کے سارے قبائلی اس کے جادُو کے اثر سے ناچ ناچ کر مر نہ جاتے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

مصنف: وقار خلیل

صفحات: 35

قیمت: -/11 روپے

مصنف: حسن عسکری کاظمی

صفحات: 131

قیمت: -/23 روپے

مصنف: سمیع مسعود خاں

مترجم: شریف احمد

صفحات: 16

قیمت: -/15 روپے

مصنف: اطہر پرویز

صفحات: 148

قیمت: -/20 روپے

مصنف: ڈینیل ڈیفو

تلخیص: م ندیم

صفحات: 80

قیمت: -/11 روپے

مصنف: لاولن تھدانی

مترجم: تسنیم زیدی

صفحات: 16

قیمت: -/12 روپے

ISBN: 978-81-7587-440-4

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025